اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

جنوری ۲۰۲۱ء

ماہنامہ

# البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

# فہرست کتب

## ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری اور ان کا حلقۂ فکر

* سرمایہ دارانہ نظام ایک تعارف: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* جمہوریت یا اسلام: زاہد صدیق، وہاب سوری، جاوید اقبال، امین اشعر، ڈاکٹر جاوید، ذیشان ارشد
* سرمایہ دارانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ: زاہد صدیق، وہاب سوری، جاوید اقبال، ڈاکٹر جاوید
* سرمایہ دارانہ عقائد و نظریات: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* انقلابی عمل۔ایک اسلامی تجزیہ: زاہد صدیق، وہاب سوری، جاوید اقبال، امین اشعر، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* تصوف اور تحریک اسلامی کے کارکنان: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* سوشل سائنسز، جمہوریت اور اسلامی بنکاری کا فکری پس منظر اور تنقیدی جائزہ: زاہد صدیق مغل
* اسلام اور جدید سائنس۔نئے تناظر میں: محمد ظفر اقبال
* جماعت اسلامی کے زوال کے اسباب اور احیاء کے تقاضے: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* تحریک لال مسجد۔ایک انقلابی عمل: جاوید اقبال، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، یونس قادری
* اسلامی تمویلی نظام۔اسلامی بنکاری کا متبادل: یونس قادری
* سرمایہ داری کے نقیب: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* اصلاح، انقلاب اور اسلامی گروہوں کی معاصرانہ جدوجہد: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* سرمایہ دارانہ نظام ایک تعارف (برائے طلبہ مدارس): ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
* مقالاتِ تفہیمِ مغرب۔کلامیات و علمیات: ڈاکٹر زاہد صدیق مغل
* Capitalist Values and Ideologies-An Islamic Approach: Dr.Javed Akbar Ansari
* Rejecting Freedom and Progress: Dr. Javed Akbar Ansari

رابطہ برائے خرید کتب: امین اشعر 0333-2122756

# ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۵، شمارہ۱، جنوری ۲۰۲۱ء/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۲ھ

## مشمولات

O تعلیم وتربیت
- حکومتی یکساں نصاب-تعلیم کے ساتھ بھونڈا مذاق پروفیسر ملک محمد حسین ۴
- علم وعمل میں تلازم ڈاکٹر محمد امین ۷
- تعلیمی اداروں میں جنسی دہشت گردی نائب مدیر ۹
- نفسی قوتوں کا فہم بذریعہ نصابی کتب حافظ محمد موسیٰ بھٹو ۱۲
- ماہر تعلیم عزیز احمد مرزا کی یاد میں نائب مدیر ۱۵

O کورونا
- کورونا: مغرب کی صحت پالیسی کا منطقی نتیجہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ۱۹
- کورونا: ابلاغی دہشت گردی ڈاکٹر شہزاد اقبال شام ۲۸
- کورونا میں تعلیمی اداروں کی بندش ادارہ ۳۰

O مطالعۂ کتاب
- ڈاکٹر جاوید اکبر انصای کی کتاب کا تجزیاتی مطالعہ مدیر ۳۲
- پاکستان میں غلبۂ دین کی حکمت عملی: تبدیلی ناگزیر ہے

O تفہیم مغرب
- سیکولرزم خلافِ عقل ودانش ہے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۳۶
- مغرب کا جدید مذہب: 'ہیومنزم' ڈاکٹر زاہد صدیق مغل ۳۷

O تفہیم دین
- دینی مباحث میں اختلاف، تنقید اور گمراہی مدیر ۳۹
- مقاصد بعثت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حافظ عاطف وحید ۴۴
- اصطلاحات کی جنگ ڈاکٹر طاہر الاسلام ۴۷

O اسلام اور پاکستان
- تجاویز برائے تحریک انسدادِ سود ڈاکٹر محمد امین ۵۲
- نوحۂ سقوطِ ڈھاکہ: ۱۶ دسمبر احمد فراز ۵۳

O استفسارات
تجدد کا شبہ مدیر ۵۴

O ایک لوہار کی
منافقت مردہ باد عبداللہ میر ۵۵

O اشاریہ البرہان ۲۰۲۰ء ادارہ ۵۶

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

# حکومتی یکساں نصاب-اسلام، دوقومی نظریہ اور تعلیم کے ساتھ بھونڈا مذاق

وزارت وفاقی تعلیم نے دعویٰ کیا کہ پی ٹی آئی کی حکومت نے تاریخ میں پہلی مرتبہ سنگل نیشنل کریکولم کے نام سے یکساں قومی نصاب تعلیم تیار کیا ہے جو وہ ملک بھر کے تمام تعلیمی اداروں میں نافذ کرنے جارہی ہے۔ اس کے جواب میں غیر جانبدار ماہرین تعلیم نے دو باتیں دلائل کے ساتھ بتائیں: ایک تو یہ کہ جب سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ملک میں یکساں نصاب تعلیم ہی رائج رہا ہے۔ ہاں جو ادارے قومی نظامِ تعلیم کا حصہ نہیں ہیں یعنی وہ بیرونی امتحانی اداروں کے امتحانات میں اپنے طالب علموں کو بٹھاتے ہیں وہ بیرونی ملکوں اور اداروں کا نصاب تعلیم اختیار کرتے ہیں اور اب بھی ایسا ہی ہوگا کہ جو تعلیمی ادارے (سرکاری یا پرائیویٹ) اپنے طلباء کی بیرونی امتحانات یعنی اولیول، اے لیول وغیرہ کا امتحان دلاتے ہیں وہ حکومت کا نام نہاد سنگل نیشنل کریکولم اختیار نہیں کریں گے۔ رہ گئے دینی مدارس، تو اگر ان کے ہاں پرائمری، مڈل، ثانوی سطح کی کلاسیں ہوں تو وہ تو پہلے ہی قومی نصاب تعلیم استعمال کرتے ہیں اور مقامی تعلیمی بورڈز کا امتحان دلاتے ہیں۔ جس سطح سے درسِ نظامی شروع ہوتا ہے تو درسِ نظامی میں تو سنگل نیشنل کریکولم زیر استعمال نہیں آئے گا اور ظاہر ہے درسِ نظامی کے لحاظ سے سنگل نیشنل کریکولم غیر متعلق (Irrelevant) ہے۔ اس طرح یہ دعویٰ کہ موجودہ حکومت نے پہلی مرتبہ یکساں قومی نصاب تعلیم تیار کر کے رائج کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے سراسر ایک جعلی دعویٰ نظر آتا ہے۔

ماہرین تعلیم جو دوسری بات بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ سنگل نیشنل کریکولم فی الحقیقت ۲۰۰۶ء کا مشرف عہد کا تیار کردہ نصاب تعلیم ہے۔ اس نصاب میں زیادہ سے زیادہ ۱۰ فیصد کمی بیشی کی گئی ہے۔ ہاں ایک نئی بات ضروری کی گئی ہے کہ اسلامی اقدار کی بجائے ہیومنزم کی بے خدا اور سیکولر اقدار نصاب اور درسی کتب کے تانے بانے میں ڈال دینے کی کوشش کی گئی ہے نیز اسلامیات کے علاوہ دیگر مضامین کے نصابی مواد اور درسی کتب کے لوازمے میں سے اسلامی تصورات خارج کردیے گئے ہیں اور یہ سب کچھ امریکی کمیشن برائے بین الاقوامی مذہبی آزادی

(USCIRF)،عیسائی تنظیموں اور ہود بھائی لابی کی این جی اوز کے مطالبے پر کیا گیا ہے۔

تیسری بات جو ایک حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ تمام صوبوں میں پہلے ہی ۲۰۰۶ء کا قومی نصاب تعلیم رائج ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ ہر صوبے نے اپنے نصابی ادارے اور ٹیکسٹ بک بورڈ کی مہر نصب کی ہوئی ہے لہٰذا اب اگر سنگل نیشنل کریکولم کے نام سے کوئی نیا نصاب رائج ہوگا تو محض وزارت وفاقی تعلیم کی نئی ماڈل درسی کتب رائج ہوں گی جب کہ نصاب تعلیم کی نوعیت میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں آئے گی۔ ہاں ہیومنزم کی اقدار ہمارے بچوں کے معصوم ذہنوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے گی۔

اب آتے ہیں اس امر کی طرف کی سنگل نیشنل کریکولم کے رائج ہونے سے غریب امیر کا فرق ختم ہوگا،طبقاتی تقسیم کی نفی ہوگی اور قومی یکجہتی کا زریں عہد طلوع ہوگا۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یکساں قومی نصاب تعلیم کے نفاذ سے یہ سب کچھ ہوسکتا تو جیسا کہ ہم سطور بالا میں واضح کر چکے ہیں کہ ملک میں پچھلے ۳۷ سالوں میں یکساں قومی نصاب ہی رائج رہا ہے لیکن طبقاتی تقسیم اور ملی یکجہتی کا فقدان تو روز افزوں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب تعلیمی اداروں میں تعلیمی سہولتوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہوگا، جب ایک طرف یہ صورتِ حال ہوگی کہ چاک اور ٹاک (Talk) بھی مؤثر طریقے سے کرنے کا ماحول نہیں ہوگا اور دوسری طرف جدید ترین تدریسی سہولتیں اور سامان میسر ہوگا۔ ایک طرف گرمی سردی کے شدید موسمی ماحول میں گرد آلو ٹاٹ بھی میسر نہیں ہوں گے اور دوسری طرف تدریسی ماحول کے لیے ہیٹنگ اور کُولنگ کی جدید سہولتیں وافر ہوں گی تو محض نصاب اور کتاب کو ایک جیسا کرنے سے تو طبقہ واریت ختم نہیں ہوسکتی۔ پنجاب کابینہ نے سنگل نیشنل کریکولم کے نفاذ کی منظوری دیتے ہوئے جن بلند توقعات کا ذکر کیا ہے اس کی حقیقت جاننے کے لیے وزراء کرام عثمان بزدار کے علاقے کے پس ماندہ دیہاتی سکولوں کا دورہ فرمالیں تو ان کا خیالی دعویٰ تونسہ شریف سے چند میل دور واقع پہاڑی دیہاتوں کے آس پاس واقع بے آب وگیاہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے لڑھکتا ہوا نظر آئے گا۔ وطن عزیز کی تمام سابقہ حکومتوں کا گزارہ بلند بانگ جھوٹے دعوؤں اور میڈیائی پروپیگنڈہ پر ہی رہا ہے لیکن موجودہ حکومت اور خاص کر جناب عمران خان تو سب کے گرو نکلے۔ پلے کچھ ہوتا نہیں ہے لیکن ڈینگیں ایسی مارتے ہیں کہ سنجیدہ لوگوں کی بھی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔

یہ حکومت اباؤٹ ٹرن (about turn)، یوٹرن اور دیگر معاملات میں تو ساری حدیں

پار کر ہی چکی تھی اب ذریعۂ تعلیم کے مسئلہ پر بھی ''بھاں'' کرگئی ہے۔ اجلاس ہوئے، ماہرین سے مشورے ہوئے اور اعلان ہوا کہ پرائمری سطح پر ذریعۂ تعلیم اور درسی کتابیں اردو میں ہوں گی۔ ہاں، اگر کوئی صوبہ اپنی صوبائی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہے تو اس کی اجازت ہے لیکن اب جو ماڈل درسی کتب صوبوں کو ارسال کرنے کا اعلان ہوا ہے ان میں ریاضی اور سائنس کی درسی کتب انگلش میں ہوں گی، اُردو کی درسی کتب اردو میں، انگریزی کی درسی کتب انگریزی میں؛ اور صرف اسلامیات پر رحم فرمایا گیا ہے کہ وہ بھی اردو میں ہوگی۔

ہم یہاں موجودہ حکومت کو باور کراتے ہیں کہ ان کے تعلیمی اقدامات، نصابِ تعلیم کے فیصلے، ذریعہ تعلیم کے ساتھ مذاق اور تعلیم دشمن تعلیمی پالیسیاں قوم کو جہالت، طبقہ واریت، مایوسی اور گرے ہوئے معیارِ تعلیم کی گہری کھائی میں دھکیل دیں گی۔

## محب وطن حلقوں سے اپیل

ہم محب وطن حلقوں، ماہرین تعلیم، دانشوروں اور صحافیوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ تعلیمی معاملات پر موجودہ حکومت کی احمقانہ پالیسیوں کے خلاف ہماری آواز کو توانا کرنے کے لیے ہمارا ساتھ دیں۔ سیاستدان تو اِس وقت اپنے سیاسی چکروں میں مصروف ہیں۔ دینی سیاسی جماعتیں بھی اپنا ایجنڈا اور اپنی سرگرمیاں تعلیمی مسائل سے صرفِ نظر کرکے چلا رہی ہیں۔ علماء کرام اپنے تمام تر زہد وتقویٰ کے باوجود حکومت کی تعلیم دشمن پالیسیوں کو سمجھ نہیں پار ہے یا مصلحتاً سمجھنا نہیں چاہتے۔ تجزیہ نگار اور کالم نگار ''جلسہ بڑا تھا یا جلسہ چھوٹا تھا'' کی بحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ عوام بے چارے مہنگائی، بے روزگاری اور کورونا کے ہاتھوں بے حال ہیں۔ بس چند مدرسین ہیں جو اپنی نحیف ونزار آواز میں قلم سے خشک ہوتی ہوئی سیاہی کے سہارے میدانِ علم وتدریس میں کھڑے ہیں اور قوم کو باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے ساتھ ان کا محبوب کپتان تعلیم کے شعبے میں بھی بے وفائی کر رہا ہے۔ کورونا نے ایک طرف کلاس رومز کے دروازے بند کرادیے ہیں تو دوسری طرف ''تاریخ میں پہلی مرتبہ'' کی جانے والی تعلیمی حماقتیں کہیں ایک طریل عرصے کے لیے ہماری نسلوں کو جہالت کے اندھیروں میں نہ دھکیل دیں۔ اسلامی قدریں پہلے بھی اس معاشرے میں کوئی نمایاں نہیں رہیں اور اب جب سنگل نیشنل کریکولم کے ذریعے ہیومنزم کی اقدار کا فروغ ہوگا اور نصاب تعلیم سیکولر بنیادوں پر مستقبل کے ذہنوں کو سیکولر بنیادوں پر تشکیل دے گا تو اللہ نہ کرے قومی یکجہتی اور دوقومی نظریہ کہیں قصہ پارینہ ہی نہ بن جائے۔

تعلیم و تربیت　　مدیر

# علم و عمل میں تلازم

ہم سمجھتے ہیں کہ ایمان و علم کا نتیجہ لازماً اعمالِ صالحہ کی صورت میں نکلنا چاہیے۔

دیکھیے! علم کیا ہے؟ علم یہ ہے کہ خدا اور نفس کی صحیح معرفت حاصل ہو جائے۔ اگر ایک آدمی کا یہ عقیدہ ہو کہ اس کا خالق و مالک، رازق و ہادی اور اس کے نفع و نقصان اور زندگی و موت پر قادر ایک اللہ ہے اور وہ اس کا عبد ہے اور اس کا کام مالک کی رضا جوئی اور اس کی عبادت و اطاعت ہے۔ اگر یہ علم، یہ عقیدہ پختہ ہو، قلب میں جاگزیں ہو تو اس پختہ یقین کے نتیجے میں عزم و ارادے کو حرکت میں آنا چاہیے اور جوارح سے مطلوبہ عمل کا صدور ہونا چاہیے۔ یہ ایک فطری، منطقی، ریاضیاتی اور سائنسی عمل ہے، دو اور دو چار کی طرح۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ آگے کو قدم اٹھاتے چلے جائیں، حرکت ہو لیکن فاصلہ طے نہ ہو۔

ایمان تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ قلب تصدیق کرے، زبان اقرار کرے اور جوارح عمل کریں اور ایمان نتیجہ ہوتا ہے علم کا، عقیدے کا۔ علم و معرفت سے قلب میں کچھ تصورات پیدا ہوتے ہیں، استقلال، استمرار اور یکسوئی سے وہ پختہ ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ارادہ وجود میں آتا ہے، عزم اس کو مہمیز دیتا ہے اور جوارح حرکت میں آتے ہیں۔ ایسا ہونا ضروری ہے اور علم کا نتیجہ لازماً عمل کی صورت میں نکلنا چاہیے۔

اگر ایسا نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی نفس مریض ہے اور قلب فکری یکسوئی سے محروم ہے۔ لہٰذا اے ماہرین تعلیم، اے علماء کرام! اے حکمرانو اور محکمہ تعلیم کے سربراہو! اے حکمائے امت! اے اساتذۂ کرام! اے صحافیو، ادیبو اور مصنّفو! مسلمانوں کو، مسلمان بچوں کو فکری یکسوئی بہم پہنچاؤ، انہیں فکری انتشار اور تشتت سے بچاؤ۔ ان کے قلوب و اذہان میں بیک وقت اسلام اور غیر اسلام، اسلام اور ملحدانہ مغربی فکر و تہذیب کے متضاد تصورات داخل نہ کرو۔ اگر آپ دماغ کے کمپیوٹر میں بیک وقت متضاد آرڈز فیڈ کرو گے تو وہ آؤٹ پُٹ کیسے دے گا؟ کچھ سوچو! کچھ غور کرو۔

ہمارے محقق صلحاء بیمار قلب کا علاج کیسے کرتے تھے؟ کثرتِ ذکر اور صحبتِ صالح سے۔ یعنی کثرت سے، استمرار سے، بار بار ایک ہی تصور قلب میں فیڈ کیا جارہا ہے کہ اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے (لا الٰہ الّا اللہ)، اللہ بڑا ہے، اللہ بڑا ہے (اللہ اکبر)، اللہ پاک ہے، اللہ پاک ہے (سبحان اللہ)، اللہ قابل تعریف ہے، اللہ قابل تعریف ہے (الحمدللہ) اور صحبت پر کنٹرول کہ صرف اللہ کی بات کرنے والے کی بات ہی قلب تک پہنچے اور باہر سے کوئی غلط اور اس سے متضاد بات قلب تک نہ پہنچے۔ نتیجہ یہ کہ ایمان قلب میں جم جاتا تھا، پختہ ہو جاتا تھا۔ جس کے نتیجے میں جوارح حرکت میں آتے تھے اور ان اعمال کا صدور ہوتا تھا جو اللہ کو خوش کرنے والے ہوتے تھے یعنی اعمال صالحہ۔

**حاصل** یہ کہ آج مسلمان کو ضرورت ہے فکری یکسوئی کی، اسلام پر اور اسلامی تعلیمات پر یکسوئی کی اور ہر اس تصور کو، غیر اسلامی فکر کو، تہذیب کو، دین کو، فلسفے کو، علم کو، فن کو ردّ کر دینے کی ضرورت ہے جو اس یکسوئی میں خلل ڈالے۔

---

## بقیہ: تعلیمی اداروں میں جنسی دہشت گردی

پہلے ہائر ایجوکیشن میں جنسی دہشت گردی کا ماحول تھا اور اب پرائمری سکولوں میں بھی ہماری بیٹیاں محفوظ نہیں ہیں۔ یہ سب ان تعلیمی پالیسیوں کا شاخسانہ ہے جو ہماری بدقماش حکومتیں اور ہمارے بدمعاش حکمران نافذ کیے ہوئے ہیں۔ مستقبل بچانے کی خاطر فوری طور پر قومی سطح پر ''گرینڈ نیشنل ڈائیلاگ برائے اصلاحِ تعلیم'' کی ضرورت ہے۔ کوئی ہے جو آگے بڑھے اور قوم کی رہنمائی کرے؟ حکومتوں سے مایوسی ہے۔ سیاسی جماعتوں سے مایوسی ہے اور سب سے زیادہ مایوسی دینی سیاسی جماعتوں سے ہے۔ سوچ بچار کرنے والے دانشوروں کا کوئی گروہ اگر یکجا ہو جائے اور خالص تعلیمی سطح پر کوئی لائحہ عمل قوم کو دے سکے تو شاید روشنی کی کوئی کرن پیدا ہو۔ اس وقت تو چار سُو اندھیرا ہے۔ قوم اگر اور کچھ نہیں کر سکتی تو کم از کم یک نکاتی مطالبہ تو کر دے کہ ہر سطح پر مخلوط تعلیم کو ختم کیا جائے اور تعلیمی اداروں میں اختلاطِ مرد و زن کے مواقع کا سدِّ باب کیا جائے۔ خواتین کے تعلیمی اداروں میں صرف خواتین اور مردانہ تعلیمی اداروں میں صرف مرد اساتذہ تعینات کیے جائیں۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

# تعلیمی اداروں میں جنسی دہشت گردی

البرہان کے پچھلے ماہ کے شمارے میں ہم نے تعلیمی دہشت گردی کی بات کی تھی جس میں تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم کو ہم نے تعلیمی دہشت گردی میں شمار کیا تھا۔ یونیورسٹی کی سطح پر تو مخلوط تعلیم کا نظام انگریزوں کے دورِ حکومت سے چلا آ رہا ہے لیکن سکول اور کالج کی سطح پر وطن عزیز میں اس کا رواج نہیں تھا۔ شاید بعض مشنری اداروں میں سکول کی سطح پر مخلوط تعلیم کا رواج ہو لیکن پبلک اور پرائیویٹ سطح کے تعلیمی اداروں میں یہ خرابی تقریباً مفقود تھی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب پرائیویٹ تعلیمی اداروں کا سلسلہ شروع ہوا تو اگرچہ سکول اور کالج کی سطح پر مخلوط تعلیم کی اجازت نہیں تھی اور تعلیمی ادارے رجسٹر کراتے وقت یہ بیان حلفی (Affidavit) دینا پڑتا تھا کہ ادارے میں مخلوط تعلیم نہیں ہوگی لیکن انحراف کی متعدد مثالیں موجود تھیں جو اب عمومیت اختیار کر چکی ہیں۔ ظلم یہ ہوا کہ حکومتوں نے بھی حماقت شروع کر دی اور پرائمری سطح پر مخلوط تعلیم کی اجازت دے دی اور سکول و کالج کی سطح پر مخلوط تعلیمی سٹاف کی تقرری بھی شروع کر دی۔

اس جرم کے ارتکاب میں پہل جناب شہباز شریف نے کی اور جو اذیت اب موصوف کو اٹھانا پڑ رہی ہے ممکن ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس جرم کی سزا کا کچھ حصہ بھی شامل ہو۔ کالجوں میں اب بی ایس کی کلاسوں کی وجہ سے مخلوط تعلیم کے رواجِ بد کا فلڈ گیٹ ہی کھل گیا ہے۔ پرائیویٹ تعلیمی ادارے تو اب کسی اخلاقی بندھن کے قائل نہیں رہے۔ مخلوط تعلیم، مخلوط مجالس، مخلوط میلے ٹھیلے، مخلوط ایجوکیشنل ٹرِپس، مخلوط میوزیکل کنسرٹس اور پتہ نہیں اور کیا کیا مخلوط کام کیے جا رہے ہیں۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی تو مارکیٹنگ کی بنیاد ہی مخلوط موج میلہ ہے جو یہ تعلیم کے نام پر نئی نسل کو فراہم کر رہے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ جو ساری زندگی مخلوط تعلیم کے خلاف جدوجہد کرتے رہے اور مخلوط تعلیم کے اداروں میں اختلاط کے سامنے بند باندھتے رہے اب وہ بھی گناہ کی اس دلدل میں شانوں تک ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سیکولر و لبرل کھلم کھلا آزادی کے نام پر یہ سب کچھ کرتے ہیں اور اسلامسٹ مجبوری کے نام پر ساتھ حق ہُو کے نعرے لگاتے ہوئے اس قومی جرم میں پابہ رکاب ہیں۔

تعلیمی اداروں میں ختلاطِ مرد و زن اور مخلوط تعلیمی سرگرمیوں کے جو نتائج سامنے آ رہے ہیں وہ بہت بھیانک اور تکلیف دہ ہیں۔ چند دن پہلے ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کے علاقے پیر محل کے ایک پرائمری سکول میں جو واقع رپورٹ ہوا ہے وہ بہت ہی روح فرسا ہے۔ ظلم یہ ہو رہا ہے کہ پرائمری سکولوں میں مخلوط تعلیم کر دی گئی ہے۔ اس مخلوط تعلیم کی وجہ سے پہلے طلبہ کی سطح پر مسائل تھے۔ راقم الحروف چند سال پہلے ایک این جی او کے پلیٹ فارم سے لاہور میں کچھ سرکاری سکولوں کو پیشہ ورانہ معاونت دے رہا تھا۔ جب بھی سکول کی کسی ہیڈ مسٹریس سے پوچھا کہ کوئی مسئلہ ہو تو بتائیں تو ان کا کہنا یہ ہوتا تھا کہ مخلوط تعلیم کی وجہ سے چوتھی اور پانچویں جماعت کے طلباء و طالبات کو شرمناک حرکتوں سے روکنا سب سے بڑا مسئلہ ہے یعنی کہ پانچویں جماعت کے نسبتاً زیادہ عمر کے لڑکے نوجوان استانیوں سے بھی بدتمیزی کرتے نظر آتے تھے۔ اب حکومت نے اضافی ظلم یہ کیا کہ پرائمری سکولوں میں خواتین اور مرد ایجوکیٹرز کا مخلوط سٹاف بھی لگانا شروع کیا۔ اساتذہ کے اپنے تعلقات میں تو جو رخنے پیدا ہوئے ہوں گے وہ تو رہے ایک طرف، نوجوان مرد ایجوکیٹرز نے چوتھی یا پانچویں جماعت کی لڑکیوں سے جنسی اُٹھک بیٹھک شروع کر دی ہے جس کی خبر پیر محل کے علاقے سے اے آر وائی کے پروگرام ’’سرِ عام‘‘ نے عام کر دی۔

وزیر تعلیم جناب ڈاکٹر مراد راس کا انٹرویو سنا۔ وہ وہی بونگیاں مار رہے تھے جو سیاستدانوں اور وزیروں کا خاصہ ہے۔ مثلاً یہ کہ ہم نے ایجوکیشن اتھارٹی کے سی ای او کو، ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کو اور ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر کو ہٹا دیا ہے اور تاریخ میں پہلی بار طلبہ کی حفاظت کے لیے جنسی ہراسانی کا قانون لا رہے ہیں جس کے بعد کسی کو غلط حرکت کی جرأت نہیں ہوگی۔ وزیر صاحب سے کوئی یہ پوچھے کہ ان افسروں کا کیا قصور تھا جن کو ہٹایا گیا اور کیا جنسی انحراف کے سلسلے میں پہلے کوئی قانون نہیں ہے کہ سکولوں میں یہ جرم سرزد ہو رہے ہیں؟ اس جرم کے سرزد ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ حکومت نے جرم کی سرزدگی کے لیے معاون ماحول فراہم کر رکھا ہے۔ مخلوط نظام تعلیم اس کی جڑ ہے نیز الیکٹرانک، سوشل اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے جنسی اشتہا پیدا کرنے کا سامان وافر مقدار میں موجود ہے۔ اخلاقی تربیت کا فقدان ہے۔ کچے پکے ذہنوں کے نوجوانوں کو بغیر کسی تربیت کے تعلیمی اداروں میں استاد تعینات کیا

جارہا ہے اوران سب خرابیوں کے ذمہ دارتو وزیر موصوف اوران کی حکومت ہے۔ اصل میں تو وزیر محترم اوران کی حکومت کوگھر جانا چاہیے بجائے اس کے کہ نچلے درجے کے افسروں کوقربانی کا بکرا بنایا جائے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ تعلیم کے شعبے میں درآنے والی خرابیوں کے خلاف آواز اٹھانے والا اب کوئی حلقہ نظر نہیں آتا۔ شاید سب ہی اس خرابی کے حصہ دار بن گئے ہیں۔ مخلوط تعلیم کا نظام تو شاید اب مکمل طور پر قبول کرلیا گیا ہے۔ ماضی پر نظر دوڑائیں تو "تنظیم اساتذہ پاکستان" نامی اساتذہ کی ایک تنظیم ہوتی تھی جس کا میں خود چالیس سال تک رکن رہا۔ تنظیم اساتذہ تعلیم کے شعبہ میں ہر انحراف پر بروقت نوٹس لیتی تھی اور اس کی سُنی بھی جاتی تھی۔" اسلامی جمعیت طلبہ" نامی ایک طلبہ کی فعال تنظیم ہوتی تھی جس کے خوف سے تعلیم کے شعبہ کی کئی ایک خرابیاں وقوع پذیر ہی نہیں ہوتی تھیں اور جماعت اسلامی بھی تھی جس کا راقم بھی ایک رکن ہے لیکن شاید ہم دیگر زیادہ اہم مہموں میں مصروف ہیں اور تعلیم ہماری ترجیحات میں اب کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ انہونی اور ناگفتنی باتیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ جہاں اس سے پہلے اس قسم کے معاملات پر ایک طوفان بلاخیز برپا ہوتا تھا اب اس محاذ پر سیز فائر نظر آتا ہے۔ مجھے خود بھی تو خوداحتسابی کرنی ہے کہ کہیں مَیں بھی تو اس شر کا حصہ نہیں بن گیا؟ رہے اسلامی لابی کے باقی حلقے تو ان کے ایجنڈے ہی کچھ اور ہیں۔ اپنے اپنے برینڈ ہیں جن کو کام میں لاکر پیٹ پوجا کا سامان کیا جاتا ہے۔

پوچھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سے کارہائے ممنوعہ ہیں جو ہمارے تعلیمی اداروں میں نہیں ہورہے؟ مغرب میں آزادی ہے لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی اخلاقی بندہیں جن کو وہ عبور نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں تو آزادی بھی نہیں ہے لیکن وہ کون سی بندش ہے جس کا ہم لحاظ رکھتے ہیں؟ ابھی لاہور گرامر سکول کا سانحہ تازہ ہے۔ لاہور کی سرکاری اور پرائیویٹ یونیورسٹیوں سے ناقابل بیان خبریں آتی رہتی ہیں۔ اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور کی اعلیٰ تعلیم کی طالبات کا جنسی استحصال کے خلاف کھلا احتجاج زبانِ حال سے پکار پکار کر ہماری غیرت کو جگانے کی کوشش کررہا ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر کی کہانیاں علیحدہ ہیں۔ گرلز ہائی سکول سے سپلائی چین کے قصے سننے کی ہمت نہیں ہوتی۔ پی ایچ ڈی کی دوڑ نے خواتین ریسرچرز کو ان کے سپروائزرز کے لیے من بھاتا چارہ بنادیا ہے۔ کس کس بات پر رویا جائے اور کس کس خبر پر آہ وزاری کی جائے؟ (بقیہ صفحہ نمبر:۸)

تعلیم و تربیت

حافظ محمد موسیٰ بھٹو

# نفسی قوتوں کا فہم بذریعہ نصابی کتب

نفسی قوتوں نے معاشرہ اور ریاست میں جو ہمہ گیر اور ہمہ جہتی فساد برپا کر رکھا ہے، اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ ان قوتوں کے فہم کے بارے میں شعور اور ادراک پیدا کیا جائے اور اس کام کو فیصلہ کن اہمیت دی جائے۔ ہمارے دردمند افراد مسلسل اس بات کا رونا روتے ہیں کہ کرپٹ اہل سیاست اور بیوروکریسی نے ملک کو لوٹ مار کے ذریعہ معاشی طور پر مفلوج کر دیا ہے اور اس کا جو علاج تجویز کیا جا رہا ہے وہ قانون کو متحرک کرنے کا علاج ہے۔ لیکن قانون سے نفسی قوتیں اور حبِّ مال کے جذبات قابو میں نہیں آسکتے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ نفسی قوتوں کی سنگینی، ان کی مکروفریب کی واردات، نفس کا طریقۂ واردات اور معرفت نفس کے موضوع پر نصابی کتب میں تعلیم کا اہتمام کیا جائے تا کہ نظام تعلیم افراد میں کسی نہ کسی حد تک کم از کم نظریاتی طور پر خداشناسی اور خودشناسی کا شعور پیدا کرنے کا ذریعہ ہو۔

اسے اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام بھی کہا جاتا ہے جس میں قلب، نفس، روح اور عقل کی جداگانہ صلاحیتوں، ان کے باہمی تعلق اور ان کی خصوصیات سے بحث کی جاتی ہے۔ اسلام کا یہ اخلاقی اور روحانی نظام اگرچہ عملی نوعیت کا ہے لیکن کم از کم اس کے خطوط ذہنی اور نظریاتی طور پر تو واضح ہوں تا کہ فرد نفس پرستی کی قوتوں کی نوعیت کو کسی نہ کسی حد تک سمجھ سکے، اس سے بچاؤ کی صورت تو اس کے بعد ہی پیدا ہو سکے گی۔

مسلم ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ جب تک دل کی قوتیں نفس کی قوتوں پر غالب نہ آجائیں اس وقت تک فرد نفس پرستی کی قوتوں کے زیر اثر زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کے جنون، خود پرستی، مفاد پرستی، انانیت، حرص و ہوس، حسد و جلن، اپنی برتری، دوسروں کی تحقیر اور دنیا کی زیب و زینت کے سامان کے جذبات سے مغلوب رہے گا اور ان بیماریوں سے بچاؤ کی ساری تدابیر ناکامی سے دوچار ہوں گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ معرفت ربّ اور معرفت نفس کے علم کو نصاب تعلیم کا حصہ بنایا جائے۔ بھٹ شاہ (سندھ میں) اس سلسلہ میں صوفی یونیورسٹی قائم ہوئی ہے، لیکن اس کے قیام کے پس منظر میں یہ ذہنیت کارفرما ہے کہ تصوف

وروحانیت کا ایسا پہلو اُجاگر کیا جائے جس میں اسلامی شریعت اور حمیتِ دین کا پہلو کمزور رہو اور سارے مذاہب کے ملاپ سے تصوف کا ایک ملغوبہ تیار کیا جائے۔ اس طرح کا تصوف، ظاہر ہے، اسلام کے اخلاقی وروحانی نظام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا اور اس سے معرفت ربّ اور معرفت نفس کی صورت کا پیدا ہونا بھی ممکن نہیں کیونکہ کہ مشرکانہ مذاہب میں سرے سے ایمانی عقائد ہی صحیح نہیں تو معرفت ربّ کا ادراک کیسے ہوگا؟

## فارغ التحصیل طلبہ کی مربی اساتذہ سے صحبت ورابطہ کی افادیت

کراچی کے ایک بڑے مدرسہ کی اعطائے اسناد کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ملک کے ایک نامور عالم اور مربی نے طلبہ کو یہ اہم نصیحت فرمائی کہ مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے مربی اساتذہ سے تعلق ورابطہ قائم رکھیں ورنہ دینداری اور علم کے نام پر دنیاداری کی راہ پر گامزن ہونے اور وقت کے فتنوں سے بچنا مشکل ہے۔ نیز خدشہ ہے کہ دنیاداری کی یہ لہر اس طرح آئے گی کہ فرد کو پتہ بھی نہیں چلے گا اور وہ دنیا کی دلدل میں دھنستا چلا جائے گا بلکہ علم اسے اس کے لیے دلائل بھی فراہم کرتا رہے گا۔

فاضل شخصیت کا بیان کردہ یہ نکتہ انتہائی اہم ہے۔ سوال یہ ہے کہ مربی اساتذہ سے تعلق کے بغیر علم اور ظاہری دینداری فرد کو دنیاداری یا جدیدیت سے تاثر پذیری کی راہ پر گامزن کرنے کا باعث کیوں بنتی ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس ایک شوریدہ اور خوفناک قوت ہے۔ نفسی قوتوں کی لہریں ہر وقت اندر سے اُٹھتی رہتی ہیں اور مادہ پرستی کا ماحول نفسی قوتوں کو مزید ابھارنے کا کردار ادا کرتا ہے۔ اگر اپنے مربی اساتذہ سے تعلق قائم ہے تو ان کے دل سے للّٰہیت اور اخلاص کی لہریں طلبہ کی نفسی قوتوں کی روک تھام کا کردار ادا کرتی ہیں اور فرد کے شعور کو بھی نفسی قوتوں کی یرغمالی سے بچاتی رہتی ہیں۔ یہ تعلق منقطع ہونے کے بعد فاسد ماحول کے غلبہ کی وجہ سے نفسی قوتوں کو دل اور ذہن کو یرغمال بنا کر، علم کلام اور دلائل کے ذریعہ سے، مادیت، جدیدیت اور دنیاداری کی راہ پر لگایا جاتا ہے۔

نفس کو مربی اساتذہ کی صحبت کے انوار اور ذکر وفکر کے مجاہدے ہی اسلام کے صحیح خطوط پر گامزن رکھ سکتے ہیں، علم اور استدلال اس سلسلے میں بہت زیادہ مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ البتہ جب صحبت کے انوار اور مجاہدوں سے نفس ایک حد تک مہذب ہوجاتا ہے، اس کا قابل ذکر حد تک تزکیہ ہوجاتا ہے تو اس وقت علم غیر معمولی طور پر مفید اور بابرکت ثابت ہوتا ہے۔

اس دور میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ جن باصلاحیت فارغ علماء نے بھی مذکورہ فاضل شخصیت کی اس نصیحت کی خلاف ورزی کی، وہ جدیدیت اور دنیا داری کی تیز لہروں کی نذر ہو گئے اور ان کا علم اور ظاہری دینداری انہیں اس سے روکنے میں ناکام ثابت ہوئی۔

اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس دور میں دنیا بہت خوبصورتی سے سامنے آئی ہے۔ دنیا کے حصول کی جدوجہد میں علم کو استعمال کرنا آسان ہے۔ نیز ذہین افراد میں علم اور اجتہاد کے نام پر وقت کے فتنوں سے متاثر ہونے کی روش عام ہوئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نفس لوامہ کو طاقتور بنانا ناگزیر ہے۔ نفس کی یہی حالت نفس امارہ کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ بصورت دیگر فرد ہر وقت خطرہ سے دوچار رہتا ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اپنے مربی اساتذہ کی صحبت اور ان سے رابطہ سے فرار اور ذکر وفکر کی کم سے کم خوراک سے محرومی نفس کا بڑا فریب ہے۔ ایسے افراد پر نفسی قوتیں آسانی سے یلغار کر کے انہیں اپنا شکار بنا لیتی ہیں۔

---

## بقیہ: کورونا - ابلاغی دہشت گردی

ماضی کے تجربے اور اس گفتگو کی روشنی میں اپنے اردگرد نظر دوڑائیں۔ آپ کو اس طبقے میں کورونائی اموات نہ ہونے کے برابر ملیں گی جو دن بھر ہجوم کی شکل میں رہتا ہے۔ لیکن الگ تھلگ اشرافیہ (جو مرنے سے پہلے ہی مرچکی ہے) کا جائزہ لیں تو آپ کو اموات کی غالب تعداد اسی طبقے میں ملے گی اور یہی طبقہ بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ دن رات انگریزی میں فارسی بولتا رہتا ہے۔ لاک ڈاؤن۔۔۔ لاک ڈاؤن۔۔۔! مر گئے۔۔۔ مر گئے۔۔۔! مجھے لاک ڈاؤن سے اختلاف نہیں بشرطیکہ مقتدر طبقے کی تنخواہ، مراعات، پینشن اور گاڑی وغیرہ بند کر کے لاک ڈاؤن کیا جائے۔ اور مفلوک الحال طبقے کو زندہ رہنے کے لیے گھر پر وسائل مہیا ہوں۔ غضب خدا کا، یہ اشرافیہ مراعات تو ترقی یافتہ ممالک جیسی لیتی ہے لیکن ٹیکس دیتے وقت یہی لوگ 25 سالوں میں اپنے براہ راست ٹیکسوں کو بڑی خاموشی اور چالاکی سے 15 سے 10 فیصد نیچے لے آئے ہیں۔ گویا ملک چلے تو 90٪ مفلوک الحال طبقے کے ٹیکسوں سے اور لاک ڈاؤن سے پیدا شدہ بھوک سے مرنے کے لیے بھی یہی 90٪ مفلوک الحال ہی آگے رہیں۔ قارئین کرام ملک ان شرائط پر مزید کسی لاک ڈاؤن کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا۔

تعلیم وتربیت/یادرفتگان

پروفیسر ملک محمد حسین

# ماہرِ تعلیم عزیز احمد مرزا کی یاد میں

جدید دنیا نے گلوبل ولیج کی صورت اختیار کر لی ہے، فاصلے سمٹ گئے ہیں اور معلومات کا بہاؤ (Information Flow) آناً فاناً واقع ہو جاتا ہے۔ برآزیل، فجی آئی لینڈ یا آئس لینڈ کے آخری کنارے پر واقع ہونے والا کوئی وقوعہ پل بھر میں سوشل میڈیا کے ذریعے ہر فرد تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اسی جدید دنیا میں یہ ہو رہا ہے کہ برابر والے گھر (Next Door Neighbour) میں کچھ ہو گیا اور ساتھ والوں کو خبر تک نہیں ہوتی، اس لیے کہ ہر کوئی اپنی ذات میں گم ہے، اپنی مصیبتوں سے نبٹ رہا ہے یا اپنے مشاغل میں مشغول ہے۔ میرے ایک محبت کرنے والے دوست تھے چوہدری محمد اسلم، ڈائریکٹر سکول ایجوکیشن ریٹائر ہوئے۔ ہم دونوں ایک سال اکٹھے تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں آسٹریلیا میں رہے۔ اکثر آنا جانا رہتا یا ٹیلی فون پر رابطہ رہتا۔ پچھلے سال جوہرآباد سے ان کے گھر خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا تو ان کا نمبر ان کے بیٹے نے اٹھایا۔ کہا ابّا سے بات کراؤ۔ جواب آیا ابّا جان کو تو فوت ہوئے دو ماہ ہو گئے ہیں۔ صدمہ ہوا کہ گلوبل ولیج کے اس دور میں اتنی بے خبری۔ ساتھی اللہ نے بلالیا اور ہم الوداع بھی نہ کر سکے۔ تنظیم اساتذہ پاکستان کے سرگرم، بے لوث اور تحریک اسلامی کے لیے خلوص کے بے پایاں اثاثہ کے مالک پروفیسر حسن کراچی میں ہوتے تھے۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں میرے کلاس فیلو تھے اور جب کبھی کراچی جانا ہوتا تو ان کی میزبانی کا شرف حاصل رہتا۔ تین سال پہلے کسی کام سے کراچی جانا ہوا۔ اس دفعہ شاہراہ فیصل پر فاران ہوٹل میں قیام تھا۔ پروفیسر حسن صاحب کا گھر وہاں سے بس ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہجوم کار کی وجہ سے ملاقات نہ کر سکا۔ واپس جوہرآباد آ کر کچھ عرصہ بعد معذرت کرنے کے لیے فون کیا تو پتہ چلا کہ حسن صاحب تو وہاں چلے گئے جہاں اب رابطہ شاید جنت میں ہو، اگر اس خطا کار کو اللہ نے اپنی خاص رحمت سے بخش دیا تو کیونکہ حسن صاحب تو اپنے اعمالِ صالحہ کی وجہ سے بہر حال جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام پائیں گے۔

اب ایک نیا سانحہ کہ عزیز احمد مرزا بھی خاموشی سے اللہ کے پاس چلے گئے۔ ڈاکٹر محمد امین صاحب نے فون پر بتایا کہ انہیں ابھی ابھی ماہ نامہ نشور کراچی کا تازہ شمارہ ملا ہے جس میں خبر دی گئی ہے کہ عزیز احمد مرزا ۱۱ نومبر ۲۰۲۰ء کو لاہور میں راہی ملک عدم ہوئے۔ سر چکرا گیا۔ سوچا کہ ابھی آج تو ۷ تاریخ ہے یہ چار دن قبل ہی مرزا صاحب کی وفات کی خبر ماہنامہ نشور میں کیسے آ گئی۔ جب ہوش ٹھکانے آئے تو یاد آیا کہ آج ۷ دسمبر ہے، ۷ نومبر نہیں۔ ۲۶ دن بعد ہم بے خبروں کو اپنے بزرگ بھائی، مربی، عظیم استاذ اور نامور ماہر تعلیم کی رحلت کی خبر ملی۔

مرزا صاحب سنٹرل ماڈل سکول لوئر مال لاہور میں سائنس کے استاد رہے۔ تحریک اسلامی سے شروع سے ہی تعلق تھا۔ تنظیم اساتذہ پاکستان کے تاسیسی ارکان میں شامل تھے۔ تنظیم اساتذہ کا دستور ان کے گھر میں لکھا گیا۔ بعد ازاں وہ ابوظہبی چلے گئے جہاں جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون کے مشترکہ سکول ''اسلامیہ انگلش سکول'' کی بنیاد ڈالی، وہاں جہاں اب مرکز اسلامی ابوظہبی ہے۔ سکول اب شارع دفاع کے قریب ۵۰ کنال پر ایک وسیع وعریض عمارت میں ہے اور طلبہ کی تعداد ۲۵۰۰ سے زیادہ ہے۔ جب سکول قائم ہوا تو اس سکول کے پرنسپل، آفس سیکرٹری، گیٹ کے دربان، سکول بس کے کنڈکٹر واحد شخصیت عزیز احمد مرزا صاحب تھے۔ ان کی شب وروز محنت اور مستحکم بنیادیں رکھنے کی وجہ سے اسلامیہ انگلش سکول ابوظہبی کے چوٹی کے تعلیمی اداروں میں شمار ہوتا ہے۔ میں خود اس سکول کا دس بارہ سال ایڈوائزر رہا اور مرزا صاحب کے ہاتھوں نشوونما پانے والے اس عظیم ادارہ کی تعلیمی خدمات کا عینی شاہد ہوں۔ بعد میں مرزا صاحب نے دبئی میں اپنے ذاتی سکول کی بنیاد رکھی۔ کئی سالوں تک چلاتے رہے اور سال ۲۰۰۰ء کے لگ بھگ پردیس چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اپنے دیس کے ہو گئے۔ میں نے ۱۹۹۸ء میں درسی کتب کا ادارہ آفاق قائم کیا تو مرزا صاحب کی مشاورت حاصل رہی۔ مَیں نے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے سائنس کی درسی کتب کو اسلامائیز (Islamize) کرنے کے وژن اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے آیاتِ الٰہیہ اور انفس وآفاق کے تصورات کو تعلیم میں سمونے کی غرض سے سائنس کی درسی کتب تیار کیں۔ مرزا

صاحب چونکہ سائنس کے استاد تھے اور اسلامائیزیشن کے بھی ماہر تھے لہٰذا مَیں نے سائنس کی درسی کتب کے مسودات ان کو پیش کرتے ہوئے ان کے تبصرہ وتجاویز کی درخواست کی۔ ان کی تجاویز نہ صرف نفس مضمون کو بہتر بنانے میں ممد ثابت ہوئیں بلکہ کتب کو اسلامی تناظر دینے میں بھی رہنمائی ملی۔ افسوس یہ ہے کہ آفاق کے بعد کے ذمہ داران نے آفاق کی درسی کتب سے اسلامائزیشن کھرچ کھرچ کر نکالی اور اس کی جگہ رنگ وروغن بھر دیا۔

اس مضمون کے شروع میں پروفیسر حسن صاحب کا ذکر ہوا۔ حسن صاحب آفاق کی ریاضی کی درسی کتب کے مصنف تھے۔ ریاضی کی یہ کتابیں بھی اسلامائزیشن کا اعلیٰ نمونہ تھیں بعد میں ریاضی کی یہ کتب بھی اسلامی تناظر کے تمام حوالوں سے صاف کردی گئیں جن پر غالباً ۲۰۰۵ء میں روزنامہ ڈان کراچی نے ایک طنزیہ مضمون لکھا۔ اس مضمون کی کاپی کراچی سے غالباً حسن صاحب نے ہی مجھے ارسال کی جواب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

مرزا صاحب جماعت اسلامی اور تنظیم اساتذہ پاکستان کے سرگرم ساتھی رہے۔ بعد میں جب کچھ زعماء نے تحریک اسلامی کے نام سے علیحدہ جماعت بنالی تو مرزا صاحب بھی تحریک اسلامی میں شامل ہوگئے۔ تحریک اسلامی کے وہ چوٹی کے رہنماؤں میں شامل تھے۔ ماہنامہ نشور کراچی جو تحریک اسلامی کا ترجمان ہے میں ان کے مضامین آتے رہتے تھے۔ ان کے مضامین ہمیشہ تعلیم کے موضوع پر ہوتے اور ان کی زندگی بھر کے تجربات کے حامل ہوتے تھے۔ مرزا صاحب نظریاتی تعلیم کے حامل تھے اور ہمیشہ اس کے فروغ کے لیے کام کرتے رہے۔ مرزا صاحب تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ کے بھی سرپرست تھے اور ماہنامہ البرہان کے لیے بھی دعا گو رہتے تھے۔ اتحاد کالونی کے قریبی محلے کے اپنے پرانے گھر سے ویسٹ وڈ کالونی کے جدید رہائشی علاقے میں شفٹ ہوگئے تھے۔ ان کے اس جدید گھر میں بھی ملاقاتیں رہیں۔ ہمیشہ شفقت سے پیش آتے اور دعائیں دیتے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

تعلیم و تربیت

محمد علیم

# اور کتاب مر گئی

پبلشر نے مصنف سے کتاب لکھوائی، کچھ معاوضہ دیا

کاغذ والے سے کاغذ خریدا، معاوضہ دیا

'کمپوزر' سے کمپوزنگ کرائی، معاوضہ دیا

پروف ریڈر سے پروف ریڈنگ کرائی، معاوضہ دیا

ڈیزائنر سے ڈیزائننگ کرائی، معاوضہ دیا

پرنٹر سے پرنٹ کرائی، معاوضہ دیا

بائنڈر سے بائنڈنگ کرائی، معاوضہ دیا

ڈسٹری بیوٹر سے تقسیم کرائی، تگڑا کمیشن دیا

خریدار نے خریدی، اچھی لگی

اسکین کی، پی ڈی ایف بنائی اور

'سوشل میڈیا' پر ہزاروں لوگوں کو مفت میں بانٹ دی

پڑھنے والے نے مزے سے ڈاؤن لوڈ کر لی

ہزار روپے کا پیزا اور پانچ سو روپے کا برگر کھاتے ہوئے مفت میں پڑھ لی

مصنف اور پبلشر نے احتجاج کیا تو ان پر ''علم دشمنی'' کا لیبل لگایا

خوب صلواتیں سنائیں، بُرا بھلا کہا، طعنے دیے اور طنز کیا

پبلشر کو نقصان ہوا، اس نے مصنف کو معاوضہ دینا بند کر دیا

مصنف کو معاوضہ ملنا بند ہوا تو اس نے بھی لکھنا چھوڑ دیا

اور کتاب مر گئی!

کورونا　　ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری[١]

# کورونا کیوں پیدا ہوا؟
## یہ مغرب کے نظام سرمایہ داری کی صحت پالیسی کا منطقی نتیجہ ہے

نظام سرمایہ داری اور جاہلیت خالصہ کا مہلک ترین مظہر سائنس ہے۔ دور حاضر میں انسانیت کو تباہ کرنے کے تین ہتھیار سائنس نے فراہم کیے ہیں: جیوانجینئرنگ (Geo Engineering)، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور ادویاتی اختراعات۔

کوڈ 19 جدید ادویاتی صنعت کی ریشہ دوانیوں کا مظہر ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے پوری سرمایہ دارانہ دنیا میں متعدی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ ان متعدی بیماریوں کے پھیلنے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ادویاتی صنعت کی اختراعات کے نتیجہ میں ایسے جراثیم پیدا ہو رہے ہیں جن پر انٹی بایوٹکس (Antibiotics) کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پوری دنیا میں ایک مدت سے ادویاتی صنعت Anti-Microbial Resistance (AMR) کے پھیلاؤ کا شکار ہے یعنی ایسے جراثیم کا پھیلاؤ جن کی وجہ سے ایسے امراض ابھر رہے ہیں جو مستقلاً نا قابل علاج ہیں۔ ان امراض میں SARS، ایڈز اور کوڈ 19 شامل ہیں۔ WHO کے مطابق AMR دنیا کی حالیہ ماحولیاتی ابتری سے زیادہ اہم اور قریب تر رونما ہونے والا مظہر ہے۔

ادویاتی اختراعات کی بھر مار عالمی جنگوں کے نتیجہ میں ہوئی۔ پنسلین کے استعمال کو امریکی حکومت کی امداد کے نتیجہ میں 1942ء سے فوج میں عام کیا گیا۔ 1950ء کی دہائی میں کئی نئی موثر انٹی بایوٹک ادویات ایجاد کی گئیں اور تبھی سے انٹی بایوٹک کے مزاحمتی (Anti-biotic Resistant) جراثیم بھی تیزی سے بڑھنے لگے۔

مویو میکسما (Moyo Mckexma) کی تحقیق کے مطابق ہر نئی دوا کی ایجاد کے 3 یا 4 سال کے اندر اندر اس کا توڑ کرنے والے جراثیم پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مارگریٹ چان (Margaret Chan) جو ورلڈ ہیلتھ آرگنائیزیشن کی سابق ڈائریکٹر ہیں، ان کے

[١] دانشور، فلسفی، ماہر معیشت، کراچی

مطابق ادویاتی اختراعات اور نئے AMR جراثیم کے درمیان ہتھیاروں کی جنگ جاری ہے جس کا جدید طب کی مکمل شکست پر ختم ہونا ممکن ہے۔

دنیا میں جراثیم کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکا۔ ہر انسانی جسم میں چالیس ہزار بلین جراثیم پیدا ہوتے ہیں Pathogens ان جراثیم کو کہا جاتا ہے جو امراض کا باعث بنتے ہیں اور وائرس وہ Pathogens ہیں جو زندہ خلیوں کو تباہ کر کے ہی بڑھ سکتے ہیں۔

Pathogens کے مقابل جدید ادویاتی صنعت اپنی شکست کا اعتراف کر رہی ہے۔ 21ویں صدی میں انٹی بایوٹک کی ایجاد تقریباً بالکل ہی ختم ہوگئی اور نا قابل علاج امراض کی فہرست طویل تر ہوتی جارہی ہے۔ یہ امراض ان ادویات کے استعمال کا نتیجہ ہیں جو ان کو ختم کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔کوڈ 19 کے حملہ سے پہلے صرف امریکہ میں ہر سال تقریباً 2 لاکھ افراد نا قابل علاج امراض سے مرتے تھے۔ برطانوی تحقیق کے مطابق 2050ء تک AMR کے شکار مردوں کی تعداد دس بلین سالانہ ہوجائے گی۔

AMR کے پھیلاؤ اور انٹی بایوٹک کی بڑھتی ہوئی ناکامی سے صرف متعدی امراض ہی متاثر نہیں ہوں گے بلکہ ہر قسم کی سرجری نہایت خطرناک ہوجائے گی۔ کینسر، ٹی بی، جوڑوں کے درد اور کئی دوسرے امراض کے علاج غیر مؤثر ہوتے جائیں گے اور اسپتال میں جانا تک خطرناک ہوجائے گا کیونکہ وہاں زمین، بستر اور فضا جراثیم سے لبریز ہوتے جائیں گے۔ WHO نے پیش گوئی کی ہے کہ جدید طب کی یہ شکست 21ویں صدی میں رونما ہوجائے گی۔ WHO کے تخمینوں کے مطابق 2050ء تک ایشاء اور افریقہ میں 80 لاکھ افراد ہر سال مریں گے۔ان ممالک میں AMR کا پھیلاؤ مغربی ممالک کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تیز ہے۔ غریب ممالک میں 40 سے 60 فیصد امراض AMR سے متاثر ہیں اور OECD کی 2018ء کی تحقیق کے مطابق غریب ممالک میں امیر ممالک کے مقابلہ میں 2030ء تک AMR کا پھیلاؤ 70 گنا زیادہ تیزی سے ہوگا۔

دور حاضر میں Pathogens کی افزائش نسل کو مہمیز مل رہی ہے اور بہت سی Pathogens نے انٹی بایوٹک کو غذا کے طور پر استعمال کرنا سیکھ لیا ہے۔ جب Pathogens

پر انٹی بایوٹک حملہ آور ہوتی ہیں تو ان کی ایک دوسرے کی genes حاصل کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوجاتا چلا جاتا ہے اور وہ نئی نئی انٹی بایوٹک کو شکست دینے کے قابل ہوتی جاتی ہیں ۔یوں انٹی بایوٹک کا پھیلاؤ خود AMR کے فروغ کا سبب ہے۔

انٹی بایوٹک پھیلاؤ کے نتیجہ میں ان Pathogens کی افزائش نسل ہورہی ہے جس میں AMR کو فروغ دینے والی genes کو حاصل کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے یہ عمل 1940ء کی دہائی سے تیز تر ہوتا جارہا ہے۔انٹی بایوٹک ادویات نے Pathogens کی ان اقسام کو کم کیا ہے جو Anti-biotic سے فنا ہوسکتی ہیں اور ان اقسام کو فروغ دیا ہے جس میں AMR کی صلاحیت بڑھتی جاتی ہیں ۔ہر انٹی بایوٹک دوا خود اپنی AMR رکھنے والی Pathogens کو جنم دیتی ہے۔

Anti-Microbial دوسری ادویات سے ان معنوں میں مختلف ہیں کہ ان کے استعمال کی افزائش ان کی افادیت کو مستقل کم کرتی رہتی ہے ۔1950ء کی دہائی کے بعد سے عالمی سرمایہ دار فارماسوٹیکل کمپنیوں نے پوری دنیا میں انٹی بایوٹک ادویات کا ایک تندرفتار سیلاب برپا کردیا۔ان کمپنیوں نے تھوک کے بھاؤ پنسلین فروخت کرنے کی پالیسی اپنائی اور اس کے استعمال کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے گئے۔ بہت جلد سو سے زیادہ انٹی بایوٹک ادویات بازار میں بڑے پیمانے پر پہنچائی جانے لگیں۔ان سرمایہ دارانہ کمپنیوں کا مدعا بہتر ادویات پہنچانا نہیں بلکہ مختلف ادویات کی فراہمی سے زیادہ سے زیادہ منافع کمانا تھا۔ بیشتر انٹی بایوٹک صرف بے اثر ہی نہیں ضرررساں بھی تھیں کیونکہ وہ مریض کے جسم میں ایسے Pathogens کی نسل کو پھیلا رہی تھیں جو اس کی قوت مدافعت (Immunity) کو کم کرنے کا باعث بنے۔امریکی قصابوں نے بڑے پیمانہ پر تازہ گوشت میں انٹی بایوٹک استعمال کرنا شروع کردیا۔

1950ء اور 1960ء میں بڑی امریکی سرمایہ دارانہ کمپنیوں نے تقریباً ایک ارب ڈالر انٹی بایوٹک کی اشتہاری مہم پر خرچ کئے ان میں لیڈرل (Lederel) اور فائزر (Pfizer) سب سے نمایاں تھیں۔اس اشتہاری مہم کا ہدف پوری دنیا کے ڈاکٹر تھے جن کو تھوک کے حساب

سے مفت انٹی بایوٹک فراہم کی گئیں۔تحائف اور عطیات سے نوازا گیا اور تفریحات کے مواقع فراہم کئے گئے۔آج بھی امریکہ میں 30 فیصد انٹی بایوٹک جو ڈاکٹر تجویز کرتے ہیں، ضرررساں ہوتی ہیں۔

1950ء کی دہائی میں ادویات کی فروخت میں ہوشربا اضافہ ہوا۔1948ء میں امریکہ میں ادویات کی سالانہ پیداوار 240 ہزار ٹن تھی، 1955ء میں یہ 3 ملین ٹن ہوگئی۔1960ء تک سرمایہ دارانہ فارماسیوٹیکل کمپنیاں امریکہ میں سب سے زیادہ منافع بخش ہوگئیں اور آج بھی یہ ہوشربا منافع کمارہی ہیں۔

2019ء میں دنیا بھر میں انٹی بایوٹک کی فروخت 50 بلین ڈالر سے تجاوز کرگئی اور سرمایہ دارانہ فارماسیوٹیکل کمپنیوں کا منافع 45 بلین ہوگیا۔ ان کمپنیوں نے 2019ء میں اشتہار بازی پر تحقیق کے مقابلے میں دگنا خرچ کیا۔ یہ کمپنیاں دنیا کی کرپٹ ترین کمپنیوں میں شامل ہیں۔ 1991ء سے 2005ء تک صرف امریکن فارماسیوٹیکل کمپنیوں نے 8.35 بلین ڈالر کا جرمانہ قیمتوں کے تعین میں فراڈ کرنے اور غیر قانونی جھوٹی اشتہار بازی میں جرمانے کے طور پر ادا کیا۔ان کمپنیوں کے لیے قانون شکنی معمول کی بات ہے۔(Myers,Brustal , Merck, Pfizer,Sqruh Novaites اور Smith,Kline,Glaxo سب ہرسال قانون شکنی کی وجہ سے جرمانے ادا کرتی رہتی ہیں۔ان کمپنیوں کے اکاؤنٹ میں یہ جرمانے پیدواراری اخراجات شمار کیے جاتے ہیں۔ان کے ذریعہ جراثیم غریب ممالک میں تیزی سے پھیل رہے ہیں کیونکہ ان ممالک کا تحفظاتی نظام (Regulatory System) مجہول اور ناکارہ ہے۔ان ممالک میں فارماسیوٹیکل کمپنیوں کے جرائم بیشتر سرگرمیوں کی آماجگاہ بنتے جارہے ہیں۔انہوں نے غریب ممالک میں انٹی بایوٹک کی بھرمار کردی ہے جس کے نتیجہ میں وبائی امراض تیزی سے پھیل رہے ہیں۔

غریب ممالک میں ان فارماسیوٹیکل کمپنیوں کے اشتہارات اور تعلیمی کتابچوں میں جھوٹے دعووں کی بھرمار ہوتی ہے اور اکثر ادویات کے ممکنہ منفی اثرات (Side Effects) کا بالکل تذکرہ نہیں ہوتا۔یہ ڈاکٹروں کو ضرورت سے زیادہ ادویات کے نسخہ لکھنے

کے لئے ان کو مفت سیمپل فراہم کر کے اکساتے ہیں۔ مقامی سرمایہ دارانہ ادویاتی کمپنیاں بھی یہ تجارتی حربے کثرت سے استعمال کرتی ہیں۔ غریب مما لک میں بڑے پیمانہ پر انٹی بایوٹک بغیر ڈاکٹروں کے نسخوں کے کھلے عام بازاروں میں ملتی ہیں اور ان کے استعمال کے نتیجہ میں بدنی جراثیم میں انٹی بایوٹک سے مدافعت کی صلاحیت تیزی سے بڑھتی ہے اور جسم کا اندرونی تحفظاتی نظام منتشر ہوتا جاتا ہے۔ کئی غریب مما لک میں فارماسیوٹیکل کمپنیوں نے انٹی بایوٹک کے استعمال کو ایک ثقافتی ضرورت اپنی اشتہار بازی کے ذریعہ بنادیا ہے۔ 2000ء سے لیکر 2015ء تک انٹی بایوٹک کا استعمال بھارت میں 105 فیصد اور پاکستان میں میں 65 فیصد بڑھا۔

ہر انٹی بایوٹک ڈوز کا 80 فیصد حصہ بدن سے فضلہ کی شکل میں خارج ہوجاتا ہے اور نکاسئ آب (Sewerage) کے نظام میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں ایسے Pathogen مستقلاً پرورش پاتے رہتے ہیں جو AMR کی صلاحیت رکھتے ہیں اور دریاؤں، نہروں اور جھیلوں میں شامل ہوجاتے ہیں۔

پوری دنیا میں بڑے پیمانہ پر جانوروں کی خوراک میں انٹی بایوٹک شامل کیے جارہے ہیں۔ WHO کی تحقیق کے مطابق ہسپتالوں کے بعد جانوروں کے باڑے اور کھیت ہی AMR pathogen کی افزائش نسل کے سب سے بڑے مراکز ہیں اور گمان کیا جاتا ہے کہ کوڈ19 کی Pathogen اپنی جگہوں سے نکل کر جنگلی جانوروں میں جا گھسی۔

جتنا زیادہ ایک جانوروں کا باڑا غلیظ، متعفن اور جانوروں سے بھرا ہوا ہوگا اتنی ہی زیادہ انٹی بایوٹکس جانوروں کے جسم میں اضافہ کا سبب بنیں گی اور اتنے ہی زیادہ مقدار میں AMR Pathogen وہاں پیدا ہوتے رہیں گے اور وہ انسان جوان جانوروں کے باڑے کے قریب رہتے ہیں بہت جلد AMR Pathogen جانوروں سے حاصل کر کے خود پرورش کرنے لگتے ہیں۔ مویومیکسما کے مطابق مرغی خانوں سے بڑے پیمانہ پر AMR Pathogen شاہراہوں، کاروں اور بازاروں تک مستقل منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ مرغی خانوں اور مویشیوں کے باڑوں کے کارکن عموماً AMR Pathogen کے کیریئرز ہوتے ہیں ان کے خاندان

کے افراد اور بچے تک AMR Pathogen کے کیریئرز بن جاتے ہیں۔

ادویاتی پیدوار کے مراکز غریب ممالک کی طرف منتقل ہوتے جارہے ہیں۔ بھارت ادویات کی پیداوار کا دنیا کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ پاکستان میں بھی مقامی کمپنیاں عالمی فارماسیوٹیکل کمپنیوں کے لیے ادویات تیار کرتی ہیں۔غریب ممالک میں ادویاتی پیداوار پر پابندیاں واجبی ہوتی ہیں اور وہ بے دریغ ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ کرتی رہتی ہیں۔تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ بھارت،چین،پاکستان،جنوبی کوریا،تائیوان اور بنگلہ دیش میں ادویاتی صنعت سے خارج شدہ Pathogen Waste ہی AMR کی افزائش کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

ان ممالک کے دریائی نظام AMR Pathogen کی پرورش کے ذخائر میں تبدیل ہوگئے ہیں۔AMR Pathogen کی بہتات کے مضمرات اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب ان کے ذریعہ لائے گئے امراض ناقابل علاج ثابت ہوتے ہیں اور وباء کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ فارماسیوٹیکل کمپنیوں کی کارفرمائی کے نتیجہ میں آج AMR Pathogen پوری دنیا پر چھاتے جارہے ہیں۔اور اس عالمگیر پھیلاؤ کو antibiotic resistance کہا جاتا ہے۔ولیم گیز (William Gaze) کی تحقیق کے مطابق 1940ء سے قبل AMR Pathogen کی افزائش نسل کے مواقع نہایت محدود تھے۔ سائنس نے اپنے تجرباتی اختراعات کے ذریعہ وہ ماحول پیدا کردیا ہے جس میں نئے نئے AMR Pathogen وافر مقدار میں پنپ رہے ہیں ماحولیاتی بے ضرر بکٹیریا اس ماحول میں AMR Pathogen بنتے جارہے ہیں۔1940ء سے قبل مضر صحت بکٹیریا مخصوص علاقوں تک محدود تھے لیکن انسانوں، جانوروں اور نباتات کی تیز رفتار مواصلت نے یہ مظہری ماحولیاتی رکاوٹیں دور کردی ہیں اور بکٹیریا اور AMR Pathogen پورے عالم میں پھیل رہے ہیں۔دنیا کا کوئی خطہ ان سے محفوظ نہیں رہ گیا۔

سائنسی اختراعات کے نتیجہ میں ہم کائناتی تاریخ کے جس دور میں داخل ہوگئے ہیں اس کو Anthropocene کہتے ہیں۔ یہ دور پچھلے گیارہ ہزار سالہ دور سے جسے Holocene کہا جاتا ہے، مختلف ہے۔Anthropocene میں انسان کائناتی فطری توازن کو بڑے

پیمانے پر درہم برہم کر رہا ہے جس کے نتیجہ میں پانی کی قلت، کاربن ڈائی ایکسائڈ کے اخراج میں اضافہ، سیلابوں اور خشک سالی میں ترقی اور نوعی اقسام میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ ادویات کی بھر مار (Mass Bacteria) بھی ایسی ماحولیاتی تخریب کاری میں اضافہ کرنے والی ایک اہم قوت ہے۔ انٹی بایوٹک انبکٹیریا کو فنا کر رہی ہیں جو قدرتی ماحول اور انسانی زندگی کے نشوونما کے لیے ضروری ہیں اور AMR Pathogen اور دیگر ضرر رساں بکٹیریا کی بڑے پیمانے پر پرورش کر رہی ہیں۔

## اسباق

۱۔ سائنس مغربی تہذیب کی جاہلیت خالصہ کا مہلک ترین مظہر ہے۔ سائنس کا مقصد تسخیر کائنات ہے اور یہ عمل مذہب کے خلاف وہ بغاوت ہے جو سولہویں صدی میں شروع ہوئی اور جس کے منہج نے آج تمام جاہلی علوم کو مسخر کرلیا ہے۔ سائنسی منہج (Scientific Method) کا استعمال دنیا میں جنت تعمیر کرنے کی وہ احمقانہ جدوجہد ہے جس کو Rationality کہتے ہیں۔ اس خبیث منہج کے مفروضات کی حتمی تردید امام غزالیؒ نے گیارھویں صدی ہی میں مرتب فرمادی تھی جس کے نتیجہ میں عالم اسلام سات آٹھ سو سال تک سائنسی نحوست سے محفوظ رہا۔

۲۔ یہ دعویٰ سراسر جھوٹ ہے کہ کائنات لافانی ہے اور اس کی تخلیق اور تعمیر کی انسان قدرت رکھتا ہے اور یہ کہ انسانی ارادہ کائناتی حرکیات پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ آج یہ جھوٹ کھل کر سامنے آ گیا ہے اور AMR Pathogen کے امنڈتے ہوئے سیلاب نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سائنسدانوں کی دنیا کو جنت بنانے کی احمقانہ کوشش کے نتیجہ میں دنیا تیزی سے جہنم بن رہی ہے۔

۳۔ سائنسی سرمایہ داری جاہلی علمیت ہے۔ تسخیر کائنات اور فروغِ سرمایہ کی جدوجہد فارماسیوٹیکل کمپنیاں جس حکمت عملی کے تحت دنیا بھر میں جاری رکھے ہوئے ہیں اس نے Anti-biotic کا سیلاب برپا کر دیا ہے۔ یہ حکمت عملی انہوں نے جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے اپنائی ہے۔ AMR Pathogen سے جنگ ہارنے کے بعد

فارماسیوٹیکل کمپنیاں ایسی دوائیں بنارہی ہیں جو مریض سالہاسال استعمال کرنے کے باوجود کبھی شفایاب نہ ہوں۔ جب تک فروغ سرمایہ معاشی عمل کا مقصد رہے گا سائنسی تباہ کاری رونما ہوتی رہے گی۔ انہدام سرمایہ داری اور تسخیر منہج سائنس ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

۴۔ آج سائنسی منہج اور سرمایہ دارانہ نظاماتی غلبہ عالمی ہے اور پاکستان جیسے چھوٹے کمزور ملک کے لئے اس غلبہ سے کلی اخراج ممکن نہیں لیکن اس کو کمزور کرنے کی سعی ضروری ہے۔ اس ضمن میں قلیل المدت تجاویز حسب ذیل ہیں:

* انٹی بایوٹکس کے استعمال میں بڑے پیمانہ پر تخفیف کرائی جائے۔

* ملکی اور بین الاقوامی فارماسیوٹیکل کمپنیوں کو قومیالیا جائے۔

* ادویات کو Public Goods کی حیثیت دی جائے اور ان کی قیمتیں پیداواری خرچ کے مطابق متعین کی جائیں۔

* ادویاتی کمپنیوں کے اخراج فضلہ (Waste) کو زمین کے اندر اور دریاؤں میں آلودگی بڑھانے کا ذریعہ نہ بننے دیا جائے۔

* یونانی طب کو اتنا فروغ دیا جائے کہ وہ جدید طب اور سرجری کو مسخر کرلے۔

* بین الاقوامی مواصلات اور تجارت کو محدود کیا جائے۔

* ملک کو ادویات کے ضمن میں خود کفیل بنایا جائے۔

فی الحال پاکستان میں اسلامی جماعتیں ان میں سے کسی تجویز پر عمل کرنے یا عمل کرانے کی استطاعت نہیں رکھتیں۔ نہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہونے کے کوئی امکانات موجود ہیں۔ پاکستان کا سیاسی نظام سرمایہ دارانہ ہے اور یہاں ایک مدت تک سیکولر جماعتیں ہی حکومت کرتی رہیں گی۔ ان حالات میں سائنسی عمل کی ریشہ دوانیاں، ماحولیاتی کثافت اور وباؤں کے پھیلاؤ کے بڑھتے رہنے کا قوی امکان ہے اور ہمیں اسی ماحول میں کام کرنا ہے۔

ہم اسلامی انقلابی ہیں۔ ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ ہمیں سرمایہ داری کے خلاف ایک طویل المدت جدوجہد کرنی ہے جو صدیوں تک جاری رہے گی۔ اس جنگ کا ایک

اہم ترین محاذ سائنسی منہج اور سیاسی جاہلیت کی تسخیر ہے۔ علوم اسلامی کے تناظر میں طبعی اور فطری حرکیات کی تفہیم مرتب کرنا علماء اسلام کی ذمہ داری ہے اور یہ کام دنیا کو جنت بنانے کے لئے نہیں بلکہ انسانیت کو اس جنت میں داخل ہونے کے لیے تیار کرنے کے لئے کیا جائے گا جو اللہ رب العزت نے مومن کے لئے تیار کر رکھی ہے۔ جب طبیعی اور فطری علوم اسلامی علمیاتی تناظر میں تشکیل دے دیے جائیں گے تو اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ کائناتی حرکیات اور انسانی حیاتیات میں توازن بتدریج قائم کرنے کی تدابیر بروئے کار لائی جائیں۔

اسلامی قوتوں کی دوسری طویل المدت پیش رفت روحانی ہونا چاہئے۔ سیکولرسٹوں کو اس بات کا کوئی احساس نہیں کہ وباؤں اور دیگر آفات کا نزول معاصی کے پھیلاؤ اور خدا کے عذاب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً عمران خان نے اپنی حالیہ تقریروں میں کوڈ 19 کے عذاب سے خدا کی پناہ مانگنے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا، نہ اس نے اپنی قوم کو گناہوں سے توبہ کی تلقین کی۔ الٹا مسجدوں، خانقاہوں اور مدارس پر تالے لگا دیئے۔ سود اور سٹہ کا کاروبار جاری ہے اور IMF، چین اور امریکہ سے بھیک مانگی جارہی ہے۔ ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نو امیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

یہ اسلامی جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ پاکستان کے ثقافتی ماحول کو روحانیت سے لبریز کر دیں۔ اجتماعی توبہ، محافل ذکر اور استغفار کو اتنا عام کریں کہ عوامی زندگی منکرات سے پاک ہو جائے۔ عوامی زندگی فکرِ آخرت سے معمور ہو جائے، لوگ آفات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کریں اور شہادت کے متمنی ہوں۔ قوی امید ہے کہ جیسے جیسے اسلامی روحانیت عوامی زندگی میں سرائت کرے گی ویسے اللہ ارحم الراحمین آخرت میں ہم پر سے اپنے عذاب کو ٹال دیں گے، برکتیں نازل ہوں گی اور ہمارا ملک عالمی سرمایہ داری کے اندھیرے میں ایک تابناک ستارہ کے طور پر چمکنے لگے گا، ان شاء اللہ۔

کورونا

ڈاکٹر شہزاد اقبال شام[۱]

# کورونا-ابلاغی دہشت گردی

بلند و بالا عمارتوں میں لگی آگ بجھانے والا عملہ ہو یا جان لیوا متعدی امراض والی میتیں دفنانے والے گورکن ہوں، مسلح افواج کے جوان ہوں یا طبی عملہ، یہ سب انسانوں کو بچانے کی خاطر آگ میں جھلس کر، کبھی متعدی امراض کا شکار ہو کر اور کبھی سینے پر گولیاں سہہ کر اپنا آپ قربان کر دیتے ہیں۔ اگر یہ لوگ موت کے خوف سے اپنے فرائض چھوڑ دیں تو کیا معاشرے میں توازن نام کی کوئی شے رہ جاتی ہے؟ ایک اور طبقہ جو پورے معاشرے اور ملک کو چلاتا ہے، اس کا سینہ تان کر کھڑے ہونا ان سب زمروں سے زیادہ اہم اور لازمی ہوتا ہے کیونکہ یہ پورا ملک چلاتا ہے۔ اس کے کئی نام ہیں۔ اسے حکومت کہیں یا اشرافیہ، اسے سیاسی قیادت کا نام دیا جائے یا انتظامیہ سے موسوم کیا جائے یا سب کچھ چھوڑ کر اسے مقتدر طبقہ کہہ لیں جس میں یہ سب شامل ہیں، نام سے غرض نہیں۔ بدقسمتی سے ہمارا یہ مقتدر طبقہ گزشتہ کورونائی بحران میں عوامی توقعات پر مطلقاً پورا نہیں اترا۔ تاہم یہ امر باعث مسرت ہے کہ اس تازہ لہر میں اس طبقے کے اوسان قدرے بحال ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ دنوں میں وبا سے نمٹنے کے لئے ہیجان اور خوف کی بجائے امید اور ہوش سے کام لیا جائے گا۔

ذرا یاد کریں چند ماہ قبل کیا میدان محشر برپا تھا۔ جس کے جی میں جو آتا، وہ اسمارٹ فون پر بیان کر کے اور فیس بک، یوٹیوب پر ڈال کر اپنی کسی پوشیدہ نفسیاتی گرہ یا اذیت پسندی کی تسکین کرتا۔ عام بے بصیرت اور جاہلان مطلق کا ذکر اذکار ہی کیا، برطانیہ کی نامی گرامی یونیورسٹی امپیریل کالج آف لندن نے اپنی تحقیقی ٹیم کی رپورٹ شائع کی تو پاکستان میں کہرام مچ گیا تھا۔ ٹی وی چینلوں نے دہائی مچا دی۔ حد تو یہ کہ اسد عمر بھی بے سوچے سمجھے چٹی چمڑی کی باتوں پر نہ صرف ایمان لے آئے بلکہ اپنے کسی تحقیقی ادارے سے بے پوچھے انھوں نے اسی شام بذریعہ پریس کانفرنس ملک میں نیا ہیجان بپا کر دیا۔ میں نے ان سب نامعقولات پر پورا

---

[۱] روزنامہ 'پاکستان' نومبر ۲۰۲۰ء، کالم

کالم لکھا تھا۔لیکن چند چیزیں یاد کرانے میں حرج نہیں ہے۔برطانوی تحقیقی رپورٹ کے مطابق اگست 2020ء کے پہلے دو ہفتوں میں ہمیں پانچ لاکھ کورونا مریض اسپتال داخل کرانا تھے(10 ماہ میں کل مریض پانچ لاکھ تو کیا الحمدللہ چار لاکھ سے بھی بہت دور ہیں)۔کیا یہ بیان کرنا ابلاغی دہشت گردی نہیں ہے کہ صرف ایک دن یعنی 9 اگست کے 24 گھنٹوں میں کورونا سے 78 ہزار اموات ہوں گی؟(10 ماہ میں کورونا اموات کی تعداد الحمدللہ آٹھ ہزار ہی ہو پائی ہے)۔مزید ملاحظہ ہو،لیکن اس مزید کا انتظار کرنا پڑے گا،رپورٹ کے مطابق 26 جنوری 2021ء تک پاکستان میں کورونا سے 22 لاکھ اموات ہوں گی۔یہ رپورٹ آئے 5 ماہ ہو گئے ہیں۔باقی دو"تحقیقی"پیش گوئیوں پر اس تیسری کو قیاس کرلیں،جواب مل جائے گا۔قانون ساز اداروں سے گزارش ہے کہ اس ابلاغی دہشت گردی اور طبی ہیجان پر قانون سازی کی جائے کہ جس سے پیدا شدہ مایوسی اور ہیجان نے ملکی معیشت کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

اب اس ہیجان کو ذرا دوسرے زاویے سے دیکھیے۔10 ماہ میں کل 7803 اموات ہوئی ہیں۔ملک کے 135 اضلاع پر ان اموات کو پھیلایا جائے تو جواب فی ضلع 58 اموات آتا ہے۔اب ان اموات کو 10 ماہ پر پھیلائیں۔جواب فی ضلع فی ماہ پانچ چھ اموات آتا ہے۔کیا اموات کی یہ شرح اتنی زیادہ ہے کہ ملکی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا جائے؟مریضوں کی تعداد کو مطلقاً نظر انداز کر دیجیے کیونکہ 98 فیصد مریض صحت مند ہو کر گھروں میں ہیں۔کورونا سے اموات کی شرح دنیا میں تین فیصد ہے لیکن پاکستان میں یہ شرح دو فیصد ہے۔اموات کے اعتبار سے دنیا کے 220 ممالک میں سے پاکستان 126 ویں نمبر پر ہے حالانکہ آبادی کے لحاظ سے یہ نمبر پانچواں ہونا چاہیے۔جبکہ دیگر بیماریوں اور ٹریفک حادثات والی اموات کورونائی اموات سے کہیں زیادہ ہیں،کہیں زیادہ کیا،ناقابل بیان۔مجھے نہ تو کرونا کے وجود سے انکار ہے اور نہ اس کی ہلاکت خیزی زیر بحث ہے۔میں نے اپنی ہر تحریر میں ہمیشہ یہی کوشش کی کہ قارئین کو سوجھ بوجھ اور تدبر کی طرف لے جاؤں۔سنی سنائی"تحقیق"تو رہی ایک طرف،آپ ایک ترقی یافتہ ملک کی درجہ اول یونیورسٹی کی بین الاقوامی"تحقیق"ملاحظہ کر چکے ہیں جس کا سر ہے نہ پاؤں۔(بقیہ صفحہ نمبر:۱۴)

تعلیم و تربیت ادارہ

# کورونا میں تعلیمی اداروں کی بندش

## حکومتی فیصلہ غلط ہے اور اس کے طلبہ اور معاشرے پر تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے

* ورلڈ ہیلتھ آرگنائیزیشن (WHO) کی رپورٹ کے مطابق ۱۲ سال سے کم عمر بچوں میں کورونا وائرس کے چانسز تقریباً صفر ہیں۔

* بچوں کے عالمی ادارہ یونیسیف کی رپورٹ کے مطابق پانچ سال تک کے بچوں کو ماسک کی بھی ضرورت نہیں۔

* اقوام متحدہ کی ہدایات کے مطابق اگر لاک ڈاؤن کرنا ضروری ہو تو بھی تعلیمی ادارے کھلے رہنے چاہئیں۔

* امریکہ میں اس وقت کورونا کیسز کی تعداد پاکستان سے ۶۰۰ گناہ زیادہ ہے لیکن تعلیمی ادارے کھلے ہوئے ہیں۔ فِن لینڈ میں کورونا کے دوران ایک دن کے لیے بھی تعلیمی ادارے بند نہیں ہوئے۔

* جس دن دوبارہ اسکول بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا اس دن پاکستان میں کورونا کے کل کیسز کی تعداد ۲۵۴۷ تھی جبکہ اسی دن برطانیہ میں ۱۵۴۵۰ کیسز رپورٹ ہوئے لیکن وہاں لاک ڈاؤن کے باوجود تعلیمی ادارے کھلے ہیں۔

* وزراء تعلیم کانفرنس میں وزراء نے تسلیم کیا کہ سب سے زیادہ SOPs پر تعلیمی ادارے عمل کر رہے ہیں تو پھر صرف اسکول ہی کیوں بند کیے گئے؟

* جب پارکس، بازار، مارکیٹیں، دفاتر سب کھلے ہیں تو کیا کورونا صرف تعلیمی اداروں میں آتا ہے؟ کیا یہ سارے افراد ان جگہوں پر جانے کے بعد (خدانخواستہ) کورونا سے متاثر ہو کر بچوں کو متاثر نہیں کریں گے؟

* وزراء تعلیم کانفرنس میں چاروں صوبوں نے ڈیٹا کی بنیاد پر تعلیمی ادارے بند کرنے

کے فیصلے کی مخالفت کی پھر کس کے اشارے پر اسکول بند ہوئے؟

* اس وقت حکومت اور اپوزیشن کے جلسے پورے ملک میں ہو رہے ہیں۔ دینی مدارس بھی کھلے ہیں اور بند صرف اسکول کیے گئے ہیں۔

* اس وقت تک بلوچستان میں کورونا کیسز کی تعداد ۱۶۸۸۲ ہے کیا ان میں کوئی ایک بھی اسکول جانے والا طالب علم ہے؟ بلوچستان کی ۱۶۵ کورونا کی وجہ سے اموات میں کوئی ایک بھی اسکول کا طالب علم ہے؟

جب اعداد وشمار اس کے برعکس ہیں تو صرف تعلیمی اداروں کو کیوں ہدف بنایا گیا ہے؟

* مارچ میں اسکول بند کرنے کی وجہ سے بلوچستان کے ۳۰۰ اسکول بند ہوئے، کرایہ کی مد میں صرف کوئٹہ شہر میں اس وقت اسکولز ۲۴ کروڑ ۵۰ لاکھ کے مقروض ہیں، اساتذہ نان شبینہ کے محتاج ہوئے، حکومت نے ایک روپیہ کا بھی کسی ادارے یا استاد سے تعاون نہیں کیا تو اب حکمرانوں کی غلطیوں کا خمیازہ تعلیمی ادارے کیوں برداشت کریں؟

* اس وقت ۱۵ دن کے اندر سرد علاقوں کے اسکول معمول کے مطابق بند ہونے تھے۔ آخر ان اداروں کو امتحانات لینے سے روک کر طلبہ کا سال کیوں ضائع کیا گیا؟

* پوری دنیا میں لاک ڈاؤن کے دوران تعلیمی ادارے آخری آپشن کے طور پہ بند کیے گئے ہیں۔۔ یہاں پہلا آپشن تعلیمی ادارے ہیں۔ کیا پوری دنیا میں کسی ایک ملک کی کوئی مثال ہے جس نے تمام شعبہ جات کو کھلا رکھ کر صرف تعلیم کے شعبہ کو بند کر کے کورونا پہ قابو پایا ہو؟

* حکومت نے ایس او پیز میں ۳۰۰ افراد کی اجتماعات کی خود اجازت دی ہے پھر صرف ۳۰ طلبہ کی کلاس سے کورونا کیسے پھیلے گا؟

یہ وہ حقائق ہیں جن کی وجہ سے تعلیمی اداروں کو بند کرنا اداروں کے علاوہ معاشرہ، والدین اور بچوں کے لیے بھی تباہ کن ہے۔ اس بے وقت اور بلا وجہ تعلیم دشمن اقدام کی ہر سطح پہ مذمت اور مزاحمت ہر باشعور اور تعلیم دوست پاکستانی پر فرض ہے۔

مطالعۂ کتاب

ڈاکٹر محمد امین

# پاکستان میں غلبۂ دین کی حکمتِ عملی- تبدیلی ناگزیر ہے

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی کتاب ''اصلاح، انقلاب اور اسلامی گروہوں کی معاصرانہ جدوجہد'' کا تجزیاتی مطالعہ

''جماعت اسلامی اور انقلاب لازم وملزوم ہیں'' ڈاکٹر انصاری

۱۔ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب بزرگ دانشور، فلسفی، مفکر اور ماہر معیشت ہیں۔ رہائش کراچی میں ہے۔ ان کی فکر کے دو محور ہیں: ا نظام سرمایہ داری کا ردّ اور غلبۂ اسلام۔ وہ مشکل زبان میں لکھتے ہیں اور مخصوص اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ارشد تلامذہ میں سید خالد جامعی، ڈاکٹر زاہد صدیق مغل اور ڈاکٹر عبدالوہاب سوری معروف ہیں۔ جناب امین اشعر بھی ان کے تلمیذ اور افسر رابطہ ہیں اور ان سے ڈاکٹر صاحب کی کتابیں منگوائی جاسکتی ہیں (0333-212275)۔

۲۔ ڈاکٹر انصاری صاحب جماعت اسلامی کو اپنی جماعت کہتے ہیں اور خود کو اس کی فکر کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ وہ جماعت کو 'انقلابی' جماعت سمجھتے ہیں اور ''ہم اسلامی انقلابی ہیں'' ان کی گفتگو کا روزمرہ ہے۔ اس کتاب میں جو مخصوص اصطلاحات وہ استعمال کرتے ہیں ان میں ایک تو 'انقلابی' ہے اس سے ان کی مراد جماعت اسلامی ہے جو سیاسی جدوجہد سے اقتدار حاصل کر کے پاکستان میں دین غالب کرنا چاہتی ہے۔ 'مخلصین دین' وہ دعوتی اور اصلاحی جماعتوں (جیسے تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی) اور علماء وصوفیاء کو کہتے ہیں۔ 'سرمایہ دارانہ نظام' کو وہ مغربی فکر وتہذیب کے سمبل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

۳۔ اس کتاب میں ان کا تھیسز یہ ہے کہ جماعت اسلامی صرف سیاسی جدوجہد سے پاکستان میں اسلامی 'انقلاب' نہیں لاسکی اور نہیں لاسکتی جب تک وہ اصلاحی جماعتوں اور دوسرے مسالک کے لوگوں کو اپنے ساتھ نہ ملالے۔ چونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جماعت کا موجودہ نظریاتی اور تنظیمی ڈھانچہ اس کام کے لیے غیر موزوں ہے لہٰذا ان کی تجویز یہ ہے کہ جماعت اسے تبدیل کر دے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کی تجویز میں فکری لحاظ سے کوئی رکاوٹ نہیں کیونکہ مولانا مودودیؒ کی ایک تو فکر ہے یعنی اسلام کا ساری زندگی کے لیے نظام حیات ہونا اور انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اس کا غالب ہونا اور دوسرے اس مقصد کے لیے اختیار کی گئی حکمت عملی

ہے۔ان کا خیال ہے مولانا کی فکر صحیح تھی اور ہے لیکن ان کی بنائی ہوئی حکمت عملی کو تبدیل ہو جانا چاہیے اور حکمت عملی ایسی چیز ہے جو تبدیلی ہوتی رہنی چاہیے لہٰذا جماعت کا موجودہ دستور تبدیل ہونا چاہیے اور اسی طرح جماعت کا نظریاتی اور تنظیمی ڈھانچہ بھی تبدیل ہونا چاہیے اور اسے ایک مرکزی اسلامی پارٹی بننا چاہیے جس میں ہر مسلک (دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، شیعہ) کے لوگ اور اصلاحی جماعتوں (تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی) کے لوگوں کے شامل ہونے کی گنجائش ہو۔ جماعت ان سب لوگوں کو متحد کر کے، انہیں اپنے ساتھ سمو کر چلے تو پھر ہی کامیاب ہو گی۔ان کی رائے یہ ہے کہ جب تک 'انقلابی' اور 'مخلصین دین' یعنی غلبۂ دین کے لیے ریاستی سطح پر سیاسی جدوجہد کرنے والی جماعت اور فرد اور معاشرے کی اصلاح کے لیے کام کرنے والی تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی اکٹھی نہیں ہوں گی عوام 'انقلابیوں' کو ووٹ نہیں دیں گے کیونکہ 'انقلابی' جماعت کا فکری، دستوری اور تنظیمی سٹرکچر ایسا ہے کہ وہ اصلاح فرد اور معاشرہ کا کام کر ہی نہیں سکتی۔

* وہ مولانا مودودیؒ کو سرمایہ دارانہ نظام کے ردّ کا بھی نقیب سمجھتے ہیں کیونکہ انہوں نے اسے 'جاہلیت خالصہ' قرار دیا تھا۔

* وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر انقلابی اور اصلاحی جماعتیں مل جائیں تو الیکشن کے ذریعے اسلام غالب آ سکتا ہے اور اسلامی ریاست قائم ہو سکتی ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے داخلی تضادات سے فائدہ اٹھایا جائے اور اسے اندر سے کمزور کیا جائے۔اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرتی تنظیم کے ذریعے مسجد کو مرکز بنا کر عوامی مسائل کے حل کے لیے بھرپور محنت کی جائے اور غربت میں کمی، حصول انصاف، امن و امان، خدمت خلق وغیرہ کے لیے منظم جدوجہد کی جائے۔

* انہوں نے اپنی مجوزہ حکمت عملی پر عمل درآمد کے لیے جماعت کے نظریاتی اور دستوری ڈھانچے میں درکار تبدیلیوں کے لیے تفصیلی تجاویز بھی دی ہیں بلکہ اس کے لیے مجوزہ منشور بھی مرتب کر کے دیا ہے۔

## ہمارا تبصرہ

۴۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اس بات سے اصولی اتفاق ہے کہ جب تک فرد پر دینی محنت نہ کی جائے اور اسے دینی قوتوں کا ہمنوا نہ بنایا جائے غلبۂ دین کے لیے سیاسی جدوجہد

کامیاب نہیں ہوسکتی۔ نیز معاشرتی تنظیم کے ذریعے مسجد کو مرکز بنا کر دینی مقاصد اور عوامی مسائل کے حل کے لیے جدوجہد بھی بلاشبہ ناگزیر ہے۔ پاکستان میں غلبۂ دین کا جو حل وہ بتا رہے ہیں وہ بھی صحیح ہے یعنی دینی اصلاحی اور دینی سیاسی جماعتیں اخلاص کے ساتھ مل جائیں تو بلاشبہ بڑے معرکے سر کیے جاسکتے ہیں۔ مجوزہ اجتماعی سیاسی تحریک کے لیے جو لائحہ عمل اور منشور انہوں نے تجویز کیا ہے وہ بھی صحیح ہے۔

۵۔ لیکن انہوں نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ جو تجویز وہ پیش کررہے ہیں اس پر متعلقہ فریق عمل کرنے کے لیے تیار بھی ہیں یا نہیں؟ مثلاً وہ چاہتے ہیں کہ جماعت اسلامی اس میں مرکزی کردار ادا کرے اور اپنے نظریات اور دستور میں بنیادی تبدیلیاں لا کر ایک 'انقلابی' جماعت کا کردار ادا کرے اور دوسری ساری دینی قوتوں کو بھی اپنے ساتھ ملائے حالانکہ جماعت اسلامی ایسا کرنا نہیں چاہتی۔ اسی طرح وہ چاہتے ہیں کہ اصلاحی جماعتیں تصوف کے حلقے، دینی مدارس اور مسلکی جماعتیں بھی اپنی روش بدلیں۔ وہ بھی غلبۂ دین کے لیے جماعت اسلامی کا ساتھ دیں لیکن کیا دینی اصلاحی جماعتیں بھی یہی چاہتی ہیں؟ ہمارا خیال ہے نہیں۔

۶۔ ڈاکٹر صاحب کو اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ جو وہ چاہ رہے ہیں اس کے موانع کیا ہیں؟ ہماری رائے میں انہوں نے جن جماعتوں اور گروہوں کا ذکر کیا ہے (جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت ودعوت اسلامی، دینی مدارس، تصوف کے حلقے اور مسلکی دینی سیاسی جماعتیں) ان میں سے ہر ایک کا

i۔ اپنا اپنا 'تصور دین' ہے جو دوسروں سے الگ ہے۔

ii۔ ہر ایک کا اپنا الگ مسلک ہے جسے وہ واحد حق سمجھتے ہیں اور حق کو اس میں محصور سمجھتے ہیں یعنی صرف وہ حق پر ہیں باقی سب لوگ غلط اور گمراہ ہیں اور وہ اپنے مسلک کے لیے وہی عصبیت رکھتے ہیں جو انہیں دین کے لیے رکھنی چاہیے۔

iii۔ ہر تصور دین اور ہر مسلک کی حامل جماعتیں کئی دہائیوں سے کام کررہی ہیں۔ ان کے کارکنوں بلکہ قائدین کی بھی ان کے مخصوص تصور دین اور مخصوص مسلک کے مطابق فکری وعملی تربیت ہوئی ہے اور چونکہ وہ خود کو واحد حق سمجھتے ہیں اس لیے دوسری جماعتوں اور ان کے

افکار کے لیے ان کے کان بند ہیں۔

iv۔ خصوصاً جس جماعت (جماعت اسلامی) کو ڈاکٹر صاحب 'انقلاب' کا مرکزی کردار ادا کرتے دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے نظریات اور دستور میں بنیادی تبدیلیاں چاہتے ہیں، وہ ان کی باتوں پر عمل کرنا تو دور کی بات انہیں سننے اور ان پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اور نہ قیادت میں اتنی فکری قوت ہے کہ وہ اتنے بنیادی فیصلے کر سکے اور نہ اس پر کوئی غیر معمولی دباؤ ہے کہ وہ اس طرح کے فیصلے کرنے کا سوچے تو ڈاکٹر صاحب کس خیالی دنیا میں ہیں کہ محض ان کے ایک تجویز پیش کر دینے سے ان کی خواہش پر عمل شروع ہو جائے گا۔

v۔ یہی حال دوسری جماعتوں کا ہے مثلاً تبلیغی جماعت یا دینی مدارس یا تصوف کے حلقے، جب وہ جماعت اسلامی کے تصور دین اور مسلک و مشرب و دستور سے متفق نہیں ہیں اور نہ انہیں اتفاق کی ترغیب دینے والی کوئی قوت موجود ہے تو ڈاکٹر صاحب کیسے تصور کر سکتے ہیں کہ وہ ان کے مجوزہ 'انقلاب' کے لیے جماعت اسلامی کے ساتھ اتنا بھرپور تعاون کریں گے کہ وہ ملکی سیاست میں ایک بڑی قوت بن کر ابھرے اور انقلاب لے آئے۔

۷۔ اگر ڈاکٹر صاحب مزید غور کریں تو وہ اسی نتیجے پر پہنچیں گے جس پر ہم پہنچ چکے ہیں اور ہم نے اپنی کتاب ''پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟'' کے آخری باب میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے کہ اس وقت ضرورت ایک اصلاحی تحریک کی ہے جو جماعت اسلامی اور دوسرے دینی عناصر (اصلاحی و تبلیغی جماعتیں، دینی مدارس و مساجد، تصوف کے حلقے، مسلکی دینی سیاسی جماعتیں وغیرہ) کے تصور دین اور ان کے منہج اور لائحہ عمل کی اصلاح کی کوشش کرے اور خود اس کے پیش نظر صرف اصلاح ہی ہو، کوئی دوسرا مقصد نہ ہو۔

۸۔ ڈاکٹر صاحب بزرگ اسلامی مفکر اور دانش ور ہیں۔ ہماری ان گزارشات کو وہ تنقید کی بجائے تبادلۂ خیال سمجھیں اور تجاویز کی حیثیت سے ان پر غور کریں۔ اگر وہ اس بحث کو معروضی انداز میں آگے بڑھاتے ہیں تو ہم اسے خوش آمدید کہیں گے۔ **وآخر دعوانا ان الحمدلله ربّ العلمين.**

تفہیم مغرب

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

# سیکولرزم خلافِ عقل و دانش ہے

سیکولرازم کا مطلب یہ ہے کہ خدا اور اس کی ہدایت اور اس کی عبادت کے معاملے کو ایک شخص کی ذاتی حد تک محدود کردیا جائے، اور انفرادی زندگی کے اس چھوٹے سے دائرے کے سوا دنیا کے باقی تمام معاملات کو ہم خالص دنیاوی نقطۂ نظر سے اپنی صوابدید کے مطابق خود جس طرح چاہیں طے کریں۔ ان معاملات میں یہ سوال خارج از بحث ہونا چاہیے کہ خدا کیا کہتا ہے، اس کی ہدایت کیا ہے اور اس کی کتابوں میں کیا لکھا ہے؟ یہ نظریہ کہ خدا اور مذہب کا تعلق صرف انسان کی انفرادی زندگی سے ہے سراسر ایک مہمل نظریہ ہے جسے عقل و خرد سے کوئی سروکار نہیں۔ ظاہر بات ہے خدا اور بندے کا تعلق دو حال سے خالی نہیں ہوسکتا، یا تو خدا انسان کا اور اس ساری کائنات کا جس میں انسان رہتا ہے خالق، مالک اور حاکم ہے، یا نہیں ہے۔ اگر وہ نہ خالق ہے، نہ مالک ہے اور نہ ہی حاکم، تو اس کے ساتھ پرائیویٹ تعلق کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہایت لغو بات ہے کہ ایک ایسی غیر متعلق ہستی کی خواہ مخواہ پرستش کی جائے جس کا ہم سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اور اگر وہ فی الواقع ہمارا اور اس جہان ہست و بود کا خالق، مالک اور حاکم ہے تو اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ اس کی عمل داری (Jursidiction) محض ایک شخص کی پرائیویٹ زندگی تک محدود ہو، اور جہاں سے ایک اور ایک دو آدمیوں کا اجتماعی تعلق شروع ہوتا ہے وہیں سے اس کے اختیارات ختم ہو جائیں۔ یہ حد بندی اگر خدا نے خود کی ہے تو اس کی کوئی سند ہونی چاہیے۔ اور اگر اپنی اجتماعی زندگی میں انسان نے خدا سے بے نیاز ہو کر خود ہی خود مختاری اختیار کی ہے تو یہ اپنے خالق و مالک اور حاکم سے اس کی کھلی بغاوت ہے۔ اس سے زیادہ لغو بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک ایک شخص فرداً فرداً تو خدا کا بندہ ہو مگر یہ الگ الگ بندے جب مل کر معاشرہ بنائیں تو بندے نہ رہیں۔ اجزاء میں سے ہر ایک بندہ مگر اجزاء کا مجموعہ غیر بندہ۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا تصور صرف پاگل ہی کرسکتا ہے۔ پھر یہ بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ہمیں خدا کی اور اس کی رہنمائی کی ضرورت نہ اپنی خانگی معاشرت میں ہے، نہ محلے اور شہر میں، نہ ہائی کورٹ اور سول سیکرٹریٹ میں، نہ چھاؤنی اور پولیس لائن میں اور نہ میدان جنگ اور صلح کانفرنس میں تو آخر اس کی ضرورت ہے کہاں؟ کیوں ایسے خدا کو مانا جائے اور اس کی خواہ مخواہ پوجا پاٹ کی جائے کہ جو اتنا بے کار ہے کہ زندگی کے کسی معاملے میں بھی ہماری رہنمائی نہیں کرتا یا معاذ اللہ ایسا نادان ہے کہ کسی معاملے میں بھی اس کی ہدایت ہمیں معقول اور قابل عمل نظر نہیں آتی! (ماہنامہ ترجمان القرآن، جنوری ۲۰۰۸ء)۔

تفہیم مغرب

ڈاکٹر زاہد صدیق مغل (۱)

# مغرب کا جدید مذہب 'ہیومنزم'

## انسان، ہیومن بی انگ اور عبد ایک دوسرے سے بالکل مختلف تصورات ہیں

عام طور پر ہیومن کا ترجمہ انسان کر کے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان تو بس انسان ہی ہوتا ہے، چاہے مشرق کا ہو یا مغرب کا۔

مگر یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں بلکہ پیچیدہ ہے۔ درحقیقت ہر تہذیب (نظام زندگی) کا ایک اپنا مخصوص تصور انفرادیت ہوتا ہے۔ اس تصور انفرادیت کے تعین کی بنیاد ان سوالات کا جواب ہے کہ مَیں کون ہوں؟ زندگی کا مقصد کیا ہے، خیر کیا ہے؟ شر کیا ہے؟ بالعموم تاریخی طور پر ان سوالات کا جائز اور مقبولِ عام جواب یہ رہا ہے کہ ''میں عبد (مسلمان) ہوں'' اور طویل عرصے تک اسی تصورِ انفرادیت کو انسانیت کا جائز اظہار سمجھا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ پچھلے ادوار میں اس کے برعکس جواب دینے والے افراد اور معاشرے بھی موجود رہے ہیں لیکن اکثریتی معاشرے (جیسے تمام مذہبی معاشرے) اسی مذہبی تصورِ انفرادیت پر مبنی تھے۔

سترہویں اور اٹھارویں صدی عیسوی کے یورپی معاشروں میں تحریک تنویر کے زیر اثر اس سوال کا ایک اور جواب عام ہونا شروع ہوا (جو آج ان معاشروں میں بہت راسخ ہو چکا ہے) جس کے مطابق ''میں عبد نہیں بلکہ آزاد اور قائم بالذات (autonomous) ہوں''۔ اس تصور ذات کی ابتداء ڈیکارٹ کے جملے ''I think, therefore, I am'' سے ہوتی ہے، جس کے مطابق کائنات کی واحد ہستی جو اپنے ہونے کا جواز خود اپنے اندر رکھتی ہے نیز جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر اور منبع علم ہے وہ اکیلی ذات مَیں یعنی I ہوں۔ اس آزاد اور قائم بالذات تصورِ ذات کو تنویری فکر میں 'ہیومن' کہا جاتا ہے۔ ہیومن اپنی بندگی کی نفی اور صمدیت کا دعوی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں 'ہیومن' خدا کا باغی تصورِ ذات یا تصورِ انسان ہے۔

مشہور مغربی فلسفی فوکو کہتا ہے کہ ہیومن انسانی تاریخ میں پہلی بار سترہویں صدی میں پیدا

---

(۱) پروفیسر اکنامکس، NUST اسلام آباد

ہوا..... ان معنی میں نہیں کہ اس سے قبل دنیا میں انسان نہیں پائے جاتے تھے اور نہ ہی ان معنی میں کہ یہ کوئی زیادہ عقل مند انسان تھا اور پہلے کے انسان جاہل تھے بلکہ ان معنی میں کہ اس سے قبل کسی انسانی تہذیب اور نظام فکر میں آزادی (autonomy or self-determination) کو انفرادیت کے جائز اظہار کا مقصد سمجھا اور قبول نہیں کیا گیا۔ گویا یہ کفر والحاد کی ایک جدید شکل تھی۔

اس سے قبل ’انسانیت‘ کے لیے لفظ mankind (خدا کی رعایا و مخلوق) استعمال کیا جاتا تھا۔ ہیومینٹی (humanity) کا تصور سترہویں صدی میں وضع کیا گیا۔ ہیومن ازم کا ڈسکورس درحقیقت اسی تصور ہیومن سے نکلتا ہے جس کے مطابق انسانیت کی بنیادی صفت آزاد و قائم بالذات ہونا ہے اور عقل کا مطلب اس انسانی آزادی میں اضافے (یعنی انسان کو عملاً قائم بالذات بنانے) کو بطور مقصد حیات قبول کرنا ہے۔ ہیومینٹی جدید مغربی الحاد کا نہایت کلیدی تصور (central construct) ہے اور تنویری فکر سے برآمد ہونے والے مختلف مکاتب فکر (مثلاً لبرل ازم، سوشل ازم، نیشنل ازم وغیرہ) اسی تصور ہیومینٹی کے مختلف نظریئے، تعبیرات و توجیہات ہیں۔

جو لوگ تصورِ ذات کے تعین میں ایمانیات کی بنیادی اہمیت سے ناواقفیت کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ ’انسان تو بس انسان ہے‘ وہ ایک سطحی بات کہتے ہیں کیونکہ زندگی کا مقصد، خیر و شر، علم، حق اور عدل کے تصورات، معاشرتی و ریاستی نظم کی تشکیل وغیرہ اس سوال کا جواب تبدیل ہونے سے یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ آسان مثال سے سمجھیے کہ حضرت عیسیٰؑ بطور ایک معین شخصیت مسلمانوں اور عیسائیوں میں مشترک ہیں (کہ دونوں تاریخی طور پر ایک ہی مخصوص شخصیت کو عیسیٰ مانتے ہیں) مگر ان کے درمیان چودہ سو سال سے وجہ اختلاف ’تصورِ عیسیٰؑ‘ ہے نہ کہ ’شخصیت عیسیٰؑ‘ (یعنی ایک کے یہاں عیسیٰ ابن اللہ ہیں جبکہ دوسرے کے یہاں عیسیٰ رسول اللہ)۔ اگر کوئی یہ کہے کہ عیسیٰؑ تو بس عیسیٰؑ ہے، مسلمان اور عیسائی بلا وجہ دست و گریباں ہیں‘ تو یقیناً وہ ایک غیر علمی بات کرے گا۔ اسی طرح ہیومن کو بھی انسان کہنا اور مسلمان کو بھی انسان کہنا ایسی ہی کنفیوژن کا شکار ہونا ہے۔ ظاہر ہے وہ انسان جو خود کو خدا کا بندہ اور وہ جو خود کو خدا سمجھتا ہے بھلا کیسے یکساں زندگی (معاشرہ و ریاست) تعمیر کر سکتے ہیں؟

تفہیم دین مدیر

# دینی مباحث میں اختلاف،تنقید اور گمراہی
## حدود اور تقاضے

حال ہی میں ڈاکٹر اختر حسین عزمی صاحب کی کتاب ''آدابِ اختلاف'' ہماری نظر سے گزری۔ انہوں نے بہت عمدہ کام کیا ہے اور عملی واقعات سے اپنی باتوں کو مدلل کیا ہے۔ سہ ماہی 'حکمت قرآن' کے اکتوبر۔دسمبر ۲۰۲۰ء کے شمارے میں حافظ عاطف وحید صاحب نے بھی مختلف دینی جماعتوں کے تصورِ دین میں اختلاف رائے کو برداشت کرنے اور اس کے قابل مذمت نہ ہونے کی بات کی ہے۔ ہم البرہان میں ضرورتاً بعض اہل علم سے اختلاف کرتے ہیں، بعض پر تنقید بھی کرتے ہیں اور بعض کو گمراہ بھی کہتے ہیں، اس لیے اس بات کی وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اختلاف رائے کب مفید ہوتا ہے، کب اسے قابل برداشت سمجھنا چاہیے، کب اس پر تنقید کی جاسکتی ہے اور کب اسے گمراہی کہا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے ہم یہاں اپنے فہم کے مطابق اپنا نقطۂ نظر بیان کریں گے اور دوسروں کو یہ حق ہے کہ وہ اس سے اختلاف کریں یا اسے غلط یا صحیح سمجھیں۔

### اختلافِ مفید

علمی بحثوں میں اختلاف بعض اوقات مفید ہوتا ہے مثلاً اگر یہ بحث ہو رہی ہو کہ پاکستان سے غربت ختم کرنے کے لیے اسلامی تناظر میں کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟ تو اب اس میں اہل علم میں آراء کا تعدد اور اختلاف مفید ہے۔ حکومت کے سامنے مختلف حل آئیں گے اور وہ ان سب کو یا ان میں سے جو اسے زیادہ مفید اور مناسب لگیں انہیں اختیار کر سکے گی۔ مجھے یاد ہے جب مرحوم علامہ خالد محمود صاحب سے میری پہلی ملاقات ان کے دولت خانے پر ہوئی تو بطور تعارف مَیں نے ان کے پوچھنے پر بتایا کہ میں ملی مجلس شرعی کا سیکرٹری جنرل ہوں جو مختلف مسالک کے درمیان اختلافات کم کرنے اور ان میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی سعی کرتی ہے تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بلاشبہ علماء میں ایک دوسرے کے لیے تعصب اور نفرت نہیں ہونی چاہیے لیکن جہاں تک اختلاف کا تعلق ہے وہ ہمیشہ برا نہیں ہوتا۔ انہوں

نے کہا کہ میری رائے میں ائمہ اربعہ میں اختلاف رائے کئی لحاظ سے مفید ہے۔اس سے فقہ میں توسع پیدا ہوا ہے، اس کی ثروت میں اضافہ ہوا ہے اور حکمرانوں اور قاضیوں کے لیے اس میں آسانی ہے کہ ایک مسئلے کے کئی پہلو اور حل ان کے سامنے آتے ہیں۔تومختصر یہ کہ علمی بحث ومناقشہ میں آراء میں تعدد اور اختلاف بعض اوقات مفید ہوتا ہے، اگرچہ pÏ ý"; ïïîï¶"` رحمہ مستند حدیث نہیں ہے۔

## قابلِ برداشت اختلاف

بعض اوقات اہل علم میں اختلاف ہوتا ہے لیکن اس کی حیثیت افضل مفضول اور راجح مرجوح کی ہوتی ہے، صحیح اور غلط کی نہیں مثلاً ہمارے ہاں حنفی حضرات نماز میں ہاتھ ناف کے نیچے باندھتے ہیں، اہل حدیث بھائی ہاتھ سینے پر باندھتے ہیں جبکہ اہل تشیع ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں اور تینوں گروہ اسے سنت سمجھ کر کرتے ہیں۔گویا ایک فریق نے ان احادیث کو زیادہ صحیح اور مستند جانا جن میں ہاتھ سینے پر باندھنے کا ذکر ہے۔دوسرے گروہ نے بوجوہ ان احادیث پر عمل بہتر سمجھا جن میں ہاتھ ناف کے نیچے باندھنے کا ذکر ہے اور تیسرے نے ان احادیث کو بوجوہ زیادہ معتبر سمجھا جن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ چھوڑ کر نماز ادا کی۔اس نوع کے اختلاف رائے کو قابل برداشت سمجھا جانا چاہیے۔

## قابل تنقید اختلاف

اگر ایک عالم سمجھتا ہے کہ دوسرے عالم نے نصوص قرآن وسنت کی غلط تاویل کی ہے یا ان سے استنباط کرتے ہوئے یا حالات حاضرہ پر ان کا اطلاق کرتے ہوئے ٹھوکر کھائی ہے اور غلط رائے قائم کی ہے تو وہ اس پر تنقید کرسکتا ہے اور دلائل سے اس کے موقف کو غلط ثابت کرسکتا ہے یا دوسرے عالم کے دلائل کی تنقیح کر کے انہیں کمزور اور ناقابل ترجیح ثابت کرسکتا ہے اور یہی حق دوسرے عالم کا بھی ہے کہ وہ اپنے فہم نصوص کو صحیح ثابت کرے اور فریق اوّل پر تنقید کرے؛ تاہم اس طرح کی تنقید شائستہ، نرم اور مدلل ہونی چاہیے۔

اگر فریق اوّل یہ سمجھے کہ فریق ثانی نے وہ رائے اس لیے قائم کی ہے کہ اس میں اُس کا ذاتی فائدہ ہے یا وہ اسے حاکم کی خوشنودی کے لیے ایسا کرتا نظر آئے یا وہ اسے اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین یا کسی غیر اسلامی فکر یا تہذیب سے متاثر ہو کر وہ رائے قائم کرتا نظر آئے تو

وہ اس پر سخت تنقید کرسکتا ہے۔

## اختلاف اور گمراہی

اگر ایک عالم سمجھے کہ دوسرا عالم نصوص قرآن وسنت کی غلط تاویل کررہا ہے یا ان سے استنباط کرتے ہوئے یا حالات حاضرہ پر ان کا اطلاق کرتے ہوئے غلط رائے قائم کررہا ہے اور وہ رائے اُس نے اِس لیے قائم کی ہے کہ اِس میں اُس کا ذاتی فائدہ ہے یا وہ ایسا حاکم کی خوشنودی کے لیے کررہا ہے یا وہ کسی دوسرے دین یا کسی غیر اسلامی فکر یا تہذیب سے مرعوب ہوکر ایسا کررہا ہے اور مدلل تنبیہ کے باوجود اپنی رائے سے باز نہیں آرہا اور اس غلطی کی وجہ سے اس کے دین کا نقصان ہوگا اور دوسرے بھی اس سے متاثر ہوں گے تو وہ اس پر تنقید کرتے ہوئے اسے گمراہ (ضالّ) قرار دے سکتا ہے۔ اور گروہ شخص نہ صرف اپنی رائے پر اصرار کرے بلکہ اس کا ابلاغ بھی کرے، دوسروں تک اسے پہنچائے اور انہیں اسے قبول کرنے کی ترغیب دے تو اس پر سخت تنقید کرتے ہوئے اسے دوسروں کو گمراہ کرنے والا (مضلّ) بھی کہا جائے گا اس کی مثال غلام احمد قادیانی کی ہے جس نے ختم نبوت سے متعلق آیت ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾﴾ [الاحزاب ۳۳:۴۰] میں خَاتَم کو خاتِم پڑھنے پر اصرار کیا تا کہ اپنی نبوت کے دعوے کو ثابت کر سکے لیکن جمہور علماء نے اسے سادہ علمی اختلاف تسلیم نہیں کیا۔ اسی طرح اس نے آیات جہاد کی جو تاویل کی اسے محض علمی اختلاف سمجھ کر علماء نے قبول نہیں کیا بلکہ اس کی کافرانگریزی استعمار کی حمایت، جاہ ومال کی ذاتی حبّ، اس کے دعوی ہائے مسیح موعود، امام مہدی، ظلی وبروزی نبی وغیرہ اور ایسے ہی دیگر عوامل کی بناء پر اس پر سخت ترین تنقید کی، اسے گمراہ (ضالّ ومضلّ) قرار دیا بلکہ اس کی اور اس کے متبعین کی تکفیر بھی کی۔ جمہور علماء اسی بنیاد پر سرسید احمد خاں، غلام احمد پرویز اور جاوید احمد غامدی کو بھی ضالّ ومضلّ قرار دیتے ہیں۔

## اصلاحی نقطۂ نظر

ہم نے اوپر جو عرض کیا وہ ایک عالم اور فقیہ کا نقطۂ نظر ہے۔ وہ اہل علم جن کے پیش نظر اصلاح ہو خصوصاً ہمارے صوفیاء دینی مقاصد کے لیے اس سے تھوڑی الگ رائے رکھتے ہیں۔ وہ گنہگاروں اور کافروں کو بھی خوش آمدید کہتے ہیں تا کہ ان کی اصلاح کی جا سکے اور ان کے دل

جیت کر انہیں مائل بہ اسلام کیا جا سکے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں جتنا بھی اسلام پھیلا وہ زیادہ تر صوفیاء کے ذریعے پھیلا اور مشرق بعید (ملائشیا، انڈونیشیا وغیرہ) میں جتنا بھی اسلام پھیلا وہ صوفیاء اور تاجروں کے ذریعے پھیلا اور وہاں کسی مسلم حکمران نے جا کر جہاد سے ان علاقوں کو فتح نہیں کیا۔ تصوف کے ادارے میں آج اگرچہ بہت سے غیر اسلامی افکار اور رسوم ورواج راہ پا چکے ہیں اور کئی لوگ اسے اچھا نہیں سمجھتے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ محقق صوفیاء نے یہ منہج اختیار کر کے ماضی میں لاکھوں کروڑوں لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کر کے انہیں معصیت سے نکالا اور انہیں اچھا مسلمان بنایا۔

## ذوق اور مزاج کا اثر

مندرجہ بالا تجزیے کو اگر سامنے رکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کا مزاج اصلاحی ہوتا ہے مثلاً حیدرآباد سندھ سے ہمارے دوست اور بزرگ حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب جن لوگوں کو غلط سمجھتے ہیں ان پر تنقید کرتے ہیں لیکن وہ تنقید اتنی نرم اور میٹھی ہوتی ہے کہ وہ تنقید لگتی ہی نہیں اور جن پر تنقید کرتے ہیں خواہ وہ اُسے صحیح تسلیم نہ کریں، بہرحال اس کا برا نہیں مناتے اور نہ اس پر مشتعل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس تنقیدی مزاج رکھنے والے ہمارے بھائی اور فاضل دوست کراچی میں سید خالد جامعی صاحب ہیں جو مخالفین پر سخت تنقید کرتے ہیں اور اس کے لیے دلائل کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔

یہ راقم آثم اگرچہ اصلاح کا داعیہ بھی رکھتا ہے اور اس کے لیے کوشش بھی کرتا ہے کہ اگر تنقید کرنی پڑے تو وہ نرم اور شائستہ ہو لیکن اسے تسلیم ہے کہ وہ بعض امور میں صلح کل رویہ اختیار نہیں کر پاتا جن میں سے ایک اہم موضوع مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ہو کر بعض اہل علم کا دین اسلام کی جدید تشریح وتوضیح بلکہ مرمت کرنا ہے۔ مجھے یاد ہے البرہان کا نیا نیا اجراء ہوا تھا (یعنی ۲۰۱۰ء کی بات ہے) اور ہم نے جاوید غامدی صاحب کے خلاف کوئی سخت مضمون چھاپا۔ دوسری طرف ملی مجلس شرعی کی کوئی روداد شائع ہوئی جس میں اہل سنت کے ساتھ اہل تشیع کے علماء بھی شامل تھے تو مجھے عطاء الحق قاسمی صاحب نے کہا کہ اہل تشیع کو سارے اہل سنت گمراہ اور بعض کافر کہتے ہیں ان سے تم مصاحبت کرتے ہو اور جاوید غامدی صاحب کو (جنہیں اُس وقت سارے علماء گمراہ نہیں کہتے تھے) انہیں تم گمراہ کہتے ہو اور ان پر سخت نقد کرتے ہو؟

میں نے کہا شاید اس لیے کہ اہل تشیع کی گمراہی پرانی ہوچکی جبکہ غامدی صاحب کی گمراہی نئی نئی ہے اور نئی چوٹ زیادہ درد کرتی ہے۔ بعض احباب مجھ سے کہتے ہیں کہ تم غامدی صاحب اور دیگر متجددین کے اتنے خلاف کیوں ہو جبکہ وہ بات شائستگی سے کرتے ہیں اور دلیل کے ساتھ کرتے ہیں؟ تم اسے علمی اختلاف کیوں نہیں سمجھتے اور ان سے درگزر کیوں نہیں کرتے؟ میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ دوسرے سارے اختلافات (فقہی، کلامی، سیاسی وغیرہ) برداشت کیے جاسکتے ہیں۔اس پر بھی بحث ہوسکتی ہے کہ کوئی حدیث صحیح ہے یا نہیں یا اُس کے سارے راوی قابل اعتماد ہیں یا نہیں لیکن جو آدمی سنت کے ماخذ دین ہونے پر اختلاف کرے اور حیلے بہانے ایسا رویہ اختیار کرے جس سے سنت کا استخفاف ہوتا ہو، اس کی نفی ہوتی ہو، اسے چھوڑنے اور حجت نہ تسلیم کرنے کا رویہ سامنے آتا ہو، مَیں اسے گمراہی سمجھتا ہوں، فروعی معاملہ اور سادہ علمی اختلاف نہیں سمجھتا اور اس پر تنقید کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

## حاصلِ بحث

اختلاف، تنقید اور گمراہی کے حوالے سے ہم نے اپنا مؤقف بیان کردیا۔ اہل علم کو حق ہے کہ وہ اس سے اختلاف کریں اور جو اسے غلط سمجھتا ہے اس پر تنقید کرے۔ اگر کوئی صاحبِ علم اپنا مؤقف البرہان میں دینا چاہیں تو ہمارے صفحات حاضر ہیں بشرطِ شائستگی و استدلال۔

---

## بقیہ: انسدادِ سود کی تحریک

اسی طرح اگر سود پر پابندی لگا بھی دی جائے لیکن سادگی کی بجائے مصرفانہ اور مسرفانہ معیشت، غیر ضروری درآمدات، ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف سے قرضے نیز رشوت، فراڈ، چوری، ڈاکے، منی لانڈرنگ، کِک بیکس، کمیشن خوری، زمینوں پر ناجائز قبضے.... جاری رہیں تو صرف شریعت کی ایک بات (ترکِ سود) پر عمل اور باقی ساری متعلقہ باتوں پر عدم عمل سے مفید نتائج کیسے نکلیں گے؟

خدانخواستہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سود کے خاتمے اور حکومت کے سودی نظام کے خلاف تحریک نہ چلائی جائے۔ نہیں! یہ ضرور چلائی جائے لیکن اس کے ساتھ فرد اور معاشرے کی سطح پر بھی اسے چلایا جائے۔ نیز اس وقت ملک میں جو سیاسی افراتفری ہے اور کورونا اور سردی ہے اسے بھی ملحوظ رکھا جائے۔

تفہیم دین　　　حافظ عاطف وحید[۱]

# مقاصدِ بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

## ان میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے پہلو شامل ہیں
## لہٰذا ہمارے دینی گروہوں اور جماعتوں میں سے اصلاً کوئی کسی کی حریف نہیں

ہماری ایک تحریر سہ ماہی 'حکمت قرآن' (جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء) کے اداریے میں 'انبیاء ورُسل علیہم السلام کا مقصد بعثت اور تشکیل اُمت کا قرآنی بیانیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی جس میں قرآنی تعلیمات اور احادیث نبویہ کی روشنی میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ نصوص میں انبیاء ورسلؑ اور بالخصوص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے متعدد مقاصد اور فرائض ہائے منصبی بیان کیے گئے ہیں جن میں تلاوتِ آیاتِ الٰہیہ، تعلیم وتفسیر کتاب وشریعت، حکمت واحکام دین کی تعلیم وتبیین، اس پر ایمان لانے والوں کا ظاہری وباطنی تزکیہ وتطہیر، تعلیم وتربیت اخلاقِ حسنہ، حرم مقدس کو شرک وکفر اور بدعات کی ہر آلائش سے پاک کر کے اسے توحید وہدایت کا مرکز بنانا اور یہاں اللہ ربّ العزت کے آئین اور قانون کو بالادست اور غالب قانون کی حیثیت سے منوانا، ظلم وتعدی کے ضابطوں کا قلع قمع کرنا، مزاحم قوتوں کو علمی وعسکری شکست سے دو چار کرنا، ایسی اُمت تشکیل دینا جو انسانیت کے جو ہر شرافت وفضیلت سے آراستہ ہو اور علم، روحانیت واخلاق کے درجہ کمال پر فائض ہو۔ اس اُمت کے ایمان اور اخلاص کی خود گواہی دینا اور اس میں خلق کی ہدایت اور فریضہ شہادت علی الناس کی ادائیگی کی اہلیت اور حقانیت کا شعور اور احساس پیدا کرنا۔ یہ تمام مقاصد اور فرائض منصوص ہیں اور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افضلیت واکملیت پر دلیل بھی ہیں۔ ان مقاصد میں باہمی ربط بھی ہے اور ایک فطری تدریج بھی۔ ان میں سے کسی مقصد کو کم اہم، غیر ضروری یا غیر متعلق نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سب خارجی اور معروضی حالات کے اعتبار سے امتیوں کے اخلاصِ دین اور عزم واستقلال کے لیے میدان ہائے عمل ہیں۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطالعے سے اس اَمر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ عوام الناس میں دین کا شعور اور اس کے مطالبات پر چلنے کی خواہش پیدا کیے بغیر دین کے سیاسی غلبے کی

[۱] دانشور، ماہر معاشیات (ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے صاحبزادے)

کوشش اس لیے بے معنی بات ہے کہ جو چیز سماجی طور پر مقبول نہ ہو سکے وہ قانونی طور پر کیونکر تسلیم کی جا سکتی ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے 'وحدتِ اُمت' نامی کتابچہ (شائع کردہ مکتبہ خدام القرآن لاہور، ۲۰۰۸ء) میں یہ واضح کیا ہے کہ آج کے دور میں ہماری دینی جماعتیں جو چاہے تعلیم دیں یا ارشاد و تلقین کے کام میں مشغول ہیں یا دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے قائم کی گئی ہیں یا غلبہ و اقامت دین کی اعلانیہ جدوجہد کی خاطر ظہور پذیر ہوئی ہیں، وہ سب اپنی دانست میں مفید خدمات سرانجام دے رہی ہیں اور ان میں ایک بڑی تعداد میں اہل علم اور مخلصین کام کر رہے ہیں۔ اگر کوئی ایسا فارمولا وضع کیا جا سکے کہ ہر جماعت دوسری کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور کارِ رسالت کی ادائیگی میں باہم ایک دوسرے کو اپنا دست و بازو سمجھیں تو یہ مختلف جماعتیں اپنے اپنے نظام اور منہج میں جدا رہتے ہوئے بھی اسلام کی ایک عظیم الشان طاقت بن سکتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس صورتِ حال یہ ہے کہ عموماً ہر جماعت گروہ بندی کے گوناگوں گرداب میں پھنس کر باہم دگر متفرق اور منتشر نظر آ رہی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ سعی و عمل کا جو دائرہ کار اور نظامِ عمل ہر جماعت نے بنا رکھا ہے عملی طور پر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ خدمت دین کو اسی میں منحصر اور موقوف سمجھ رہے ہیں۔ دوسری جماعتوں سے اگر ظاہری جنگ و جدل نہیں بھی ہے تب بھی انہیں تحقیر اور بے قدری کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

ہمارا تأثر ہے کہ یہ مرض جماعتوں کے اکابرین میں زیادہ شدت سے پیدا ہوتا ہے کہ اس کیفیت میں انہیں اپنے وجود و بقا کی حفاظت کا ممکنہ سامان نظر آتا ہے۔ درآنحالیکہ واقعہ یہ ہے کہ اپنا بنایا ہوا نظام العمل اور اس کے تنظیمی و دستوری ڈھانچے ایسے منصوص و متفق علیہ نہیں ہوتے کہ ان کا اتباع ہر ایک کے لیے لازم ہو، اسی لیے ہر جماعت کے مفکرین نے خارجی حالات کے تجزیے اور دورِ حاضر میں مقصد کے حصول کی ممکنہ راہوں میں سے اپنی دانست میں زیادہ قرین امکان لائحہ عمل کو اختیار کر رکھا ہوتا ہے اور ان میں حسب ضرورت تغیر و تبدیلی وہ خود بھی کرتے رہتے ہیں۔ حالات اور ماحول بدلنے پر اپنا منہج بدل لینا کسی کے نزدیک بھی ناجائز یا مکروہ نہیں ہے۔ لیکن اپنے اپنے حالیہ منہج کے بارے میں علمی قطعیت و حتمیت کا زعم اور اس میں غلو جماعتوں میں اس قدر پایا جاتا ہے کہ اپنے مجوزہ نظام عمل کو مقصد منصوص کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ جو شخص فکری اعتبار سے یا عملی پہلو سے خواہ کتنا ہی عظیم کام کر رہا ہو اُسے اپنا بھائی اور شریک کار نہیں سمجھا جاتا۔ اور اگر کوئی ایک شخص جماعت میں شریک تھا، پھر کسی اختلاف یا ذمہ داران کے رویوں کی بنا پر شریک کار نہ رہے تو عملاً اسے اصل مقصد بلکہ دین سے ہی منحرف سمجھ لیا جاتا

ہے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو دین سے انحراف کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ چاہے وہ اصل مقصد یعنی حکم واقامت دین کی جدوجہد پہلے سے بھی زیادہ کرنے لگے۔ اس غلو کے نتیجے میں وہی تفرق پیدا ہوجاتا ہے جو جاہلی عصبیتوں میں مبتلا لوگوں میں پایا جاتا تھا۔

عمومی مشاہدہ ہے کہ حکم واقامت دین میں مشغول عناصر کا اجتہادی وذوقی اختلافات کی بنا پر باہمی تشتت وافتراق عام مسلکی تفرقے سے بھی زیادہ خطرناک شے ہے۔ اس لیے کہ مسلکی وفقہی تفرقہ اگر علم وعرفان کے جمود پر منتج ہوتا ہے تو فکری ونظریاتی تفرق شدید نوع کے زوالِ اخلاق کا باعث بنتا ہے۔ اسی لیے جن لوگوں کو اپنی اعلیٰ فکری قطعیت وحجیت کا بخار چڑھا ہوا ہو وہ مزاجی سختی، نحوست اور بڑائی کے روگ میں عام لوگوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ چنانچہ دوسری جماعتوں کے افراد کی سرعام تحلیل نفسی، بہتان طرازی اور دلائل کی ہیرا پھیری میں انہیں عار اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ یہ سب حکم واقامت دین کے اعلیٰ مقصد سے کر رہے ہوتے ہیں۔ اس مشترک رجحان کی خطرناکی کا عالم یہ ہے کہ اس سے پیدا ہونے والے نتائج اور ممنوع اور مذموم تفرق کے نتائج میں سرِ مُو فرق نہیں۔ اس لیے کہ دونوں ہی گروہ بندیوں، تفسیق، تضلیل حتیٰ کہ تکفیر تک میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور اس ضمن میں احتیاطی طور پر ادا کیے ہوئے نعرے اور دعوے بے اثر ہی رہتے ہیں۔

### البرہان

ہمیں حافظ عاطف وحید صاحب کے مؤقف سے اتفاق ہے۔ ہم اس پر خود بھی لکھتے رہے ہیں اور البرہان جون ۲۰۱۸ء میں ہم نے بھارت کے معروف عالم دین مولانا سیف اللہ رحمانی کا مضمون 'دینی جدوجہد اور تقسیم کار' بھی اس موضوع پر شائع کیا تھا بلکہ ۱۳ برس پیشتر ہم نے ملی مجلس شرعی کا آغاز اسی نیت سے کیا تھا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس طرف زیادہ پیش رفت نہیں ہوسکی جس کے متعدد اسباب ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ موجودہ حالات میں (یعنی Status Quo) کو برقرار رکھتے ہوئے دینی قوتوں میں اتحاد ویکجہتی اور فرد، معاشرے اور ریاست میں اسلامی تعلیمات پر عمل میں پیش رفت کے امکانات کم ہیں اور دینی قوتوں کے مؤقف میں تبدیلی کے لیے منظم اور طویل مدتی اصلاحی کوششوں پر فوکس کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اسی شمارے میں ہمارا مضمون ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی کتاب ''اصلاح، انقلاب اور اسلامی گروہوں کی معاصرانہ جدوجہد'' پر تبصرہ بعنوان 'مطالعۂ کتاب'۔ مدیر

تفہیم دین

ڈاکٹر طاہر الاسلام

# اصطلاحات کی جنگ

جنگیں اگرچہ توپ وتفنگ سے لڑی جاتی ہیں لیکن ان کا اصل میدان عقائد وافکار کے مباحث ہیں۔ آج عالم کفر جہاں ملتِ اسلامیہ پر آتش وآہن کی بارش برسا رہا ہے وہیں اس کے تھنک ٹینکس ہمارے تصورِ زندگی اور مذہبی ومعاشرتی اقدار کو بدلنے کے لیے بھی دن رات کوشاں ہیں۔ الفاظ ومصطلحات چونکہ پوری تہذیب کی نمائندہ ہوتی ہیں، اس لیے انہیں بگاڑنے کے لیے وہ تمام تر توانائیاں صَرف کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں استعمار اور ان کے کارندوں کے ہاں مختلف اسالیب بروئے کار لائے جاتے ہیں جن کا مختصر تذکرہ حسب ذیل ہے:

## تلبیس: ترویجِ باطل کا ایک کارگر اسلوب

باطل کی ترویج کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اصطلاحوں کی اصل حقیقت کو مستور رکھتے ہوئے ان کے خودساختہ مفاہیم کو رواج دیا جائے مثلاً سیکولرزم کو فروغ دینے کے لیے اس کا یہ معنیٰ بیان کرنا کہ ''ہر ایک کو اپنے مذہب پر رہنے کی آزادی ہے اور اس پر کوئی جبر نہیں''۔ بعض سادہ لوح اس فریب کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس کا یہی مطلب ہے تو ایک نئی اصطلاح کی حاجت ہی کیا ہے؟

مزید یہ کہ اہل مذہب کو یہ دھوکا دیا جائے کہ مذہب تو خود جبر کی نفی کرتا ہے، پس اس طرح اسلام خود سیکولر مذہب ہے۔ لیکن جب سیکولرزم کو منوا لیا تو پھر اصل نظام رائج کر دیا کہ مذہب کا سیاست وریاست، آئین وقانون اور اقتصاد ومعیشت سے کوئی تعلق نہیں؛ اور یہ کہ مذہب کو مسجد ومندر کی چار دیواری تک محدود رکھو!

## اصطلاحات کے گمراہ کن اور دل فریب تراجم

* باطل افکار ونظریات پھیلانے کے لیے اہل باطل جو مختلف ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں ان میں ایک تکنیک یہ ہے کہ تباہ کن مفاہیم کی حامل اصطلاحوں کو ایسے خوش نما الفاظ میں دوسری زبانوں میں منتقل کیا جائے کہ اصل حقیقت پوشیدہ رہے اور لوگ التباسِ فکری میں مبتلا

ہو جائیں مثلاً ڈیموکریسی (Democracy) کا ترجمہ 'جمہوریت' کرنا؛ حالانکہ جمہوریت اس لفظ کا درست ترجمہ نہیں ہے، بلکہ 'عوام کی حاکمیت' اس کا صحیح مفہوم ہے۔ اور معنویت کے لحاظ سے جمہوریت میں اکثریت کی اقلیت پر جبری حکومت ہوتی ہے۔ اس سے یہ ہوا کہ اسلامی لٹریچر میں موجود 'جمہور علما' کی ترکیب سے ڈیموکریسی کے جواز پر استشہاد کیا جانے لگا جبکہ دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ جمہور علما کے موقف کو قرینۂ ترجیح کے طور پر اس وقت بیان کیا جاتا ہے جب حکم شرعی کی شرح وتوضیح میں اہل علم کا اختلاف ہو جائے، جبکہ ڈیموکریسی میں شریعت کا کوئی دخل مانا ہی نہیں جاتا۔

* اسی طرح اقوامِ متحدہ کی دستاویزات میں Women Empowerment کو عربی میں 'تمکین المرأ※' (عورت کو تمکین دینا) سے تعبیر کیا گیا تو اس پر علما نے نقد کیا اور وضاحت کی کہ اس کا صحیح ترجمہ 'استقواء المرأ※' بنتا ہے، یعنی 'عورت کو قوت دینا' یا قوی کرنا تاکہ وہ مردوں سے اپنے حقوق کے لیے جنگ کر سکے۔ یہ لفظ اصلاً Feminist تحریک کے ایک تصور کو بیان کرتا ہے جو اسلامی مفاہیم سے قطعی متصادم ہے۔ تمکین تو اسلام نے عورت کو پہلے ہی سے عطا کر رکھی ہے اور اس کے تمام حقوق کی مکمل نگہداشت کرتے ہوئے مردوں کو ان کی ادائیگی کا پابند کیا ہے۔

* اسی طرح عربی زبان میں سیکولرزم کا ترجمہ 'العلمانیہ' کیا گیا لیکن یہ بھی بالکل غلط اور دور از کار ہے کیوں کہ یہ عربی لفظ علم سے مشتق ہے جب کہ Secularism میں علم کا کوئی مفہوم نہیں پایا جاتا۔ اس کا صحیح مفہوم 'لادینیت' یا مذہب کو دیگر امورِ زندگی (بشمول سیاست، قانون، معیشت، معاشرت) سے یک قلم جدا کر دینا ہے کہ ان معاملات میں اس کا کوئی کردار نہ ہو۔

## غیر اسلامی تناظرات کا مسلم تہذیب پر اطلاق

* بعض الفاظ ایسے ہیں جو یورپ کے قرونِ مظلمہ (Dark Ages) میں چرچ اور دیگر طبقہ ہائے فکر کے مابین ہونے والی آویزشوں کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے مثلاً Fundamentalist جس کا ترجمہ عربی میں "[illegible]" اور اردو میں 'بنیاد پرستی' کیا جاتا ہے۔ یہ منفی معنوں میں مستعمل ہے کیوں کہ اس سے اہلِ کلیسا کا وہ رویہ مراد لیا جاتا ہے جو انہوں نے نئے سائنسی نظریات کے بالمقابل اپنایا کہ انہیں خلافِ مذہب قرار دے کر یکسر

مسترد کر دیا جائے، حالانکہ یہ جدید نظریات اصل مذہب کے بجائے مذہب کے نام پر خود تراشیدہ مذہبی تشریحات کے خلاف تھے۔ اسلام میں ایسی کسی جنگ و پیکار کا وجود ہی پایا نہیں جاتا کہ انسانی تجربات و اکتشافات اور ان کے حاصلات اصلاً دین کا موضوع ہی نہیں ہیں۔ اس کا بنیادی محور خیر و شر اور ہدایت و ضلالت کے مباحث ہیں۔ پس سائنسی نظریات سے اسلام کو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے الاّ یہ کہ سائنس کا نام لے کر غلط طور پر عقائد و ایمانیات میں دخل اندازی کی کوشش کی جائے۔ اسلام میں بنیاد پسندی قابل تحسین ہے، بایں معنیٰ کہ بنیادی عقائد و افکار سے وابستگی رکھی جائے اور ان سے سرِ مو انحراف نہ کیا جائے۔

* اسی طرح کا ایک لیبل تھیوکریسی (Theocracy ہے جسے 'پاپائیت' کہہ کر بے تکلفی سے علما پر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ تھیوکریسی دراصل مذہبی پیشواؤں (Priests) کی حکومت و اقتدار سے عبارت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پوپ کا فرمایا ہوا گویا خدا کا فرمان ہے اور مذہب و قانون وہی ہے جو اس کی زبان سے نکلے۔ اس کے برعکس اسلام میں علما کو ایسی کوئی مذہبی اتھارٹی حاصل نہیں ہے۔ دین و مذہب محض وحی و تنزیل میں محصور ہے۔ علما بھی دیگر لوگوں کی مانند اس دین پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ باقی علما کی تشریحات ہیں جو اجتہاد کے زمرے میں داخل ہیں اور اجتہاد جب تک اجماع (یعنی پوری اُمت کے اتفاق) میں نہ ڈھلے ظنی رہتا ہے جس سے علمی اختلاف کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔

مختصراً یہ کہ ایسی اصطلاحیں اسلامی تہذیب میں فِٹ ہی نہیں بیٹھتیں کہ ان کا تناظر خالصتاً دوسری تہذیب اور غیر مذہب سے جُڑا ہوا ہے جو یہاں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

## متفقہ اسلامی اصطلاحوں میں تحریف

۷۔ مسلمانوں میں بعض تجدد پسند دانشور، جو جانے انجانے میں استعمار کے مقاصد کو پورا کر رہے ہیں، اپنی خودساختہ تشریحات و تعبیرات کو مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لیے صدیوں سے مروّج مذہبی لفظیات کو نت نئے معانی پہناتے ہیں؛ یعنی لفظ پرانا اور شرح نئی! مثال کے طور پر 'سنت' کا لفظ لیجیے: یہ فقہ، عقیدہ اور اُصول کی معروف اصطلاح ہے اور عمومی طور پر جب کتاب وسنت کی ترکیب بولی جائے تو ہر مسلمان اس کا یہی مفہوم سمجھتا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے اقوال و ارشادات اور افعال مراد ہیں جو کتبِ حدیث میں مندرج

ہیں۔لیکن اب بعض اربابِ فکر نے اس کے معنیٰ یہ بیان کیے ہیں کہ ''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔''

اس اصطلاح کا یہ مفہوم ہمارے مذہبی لٹریچر میں کبھی بیان نہیں ہوا؛ بنابریں یہ نادرست ہے کیوں کہ یہ فکری التباس کا باعث بنتا ہے اور عام مخاطب اس سے وہی مراد لیتا ہے جو علماء کے یہاں معروف ہے۔ پھر اس سے وہ تمام اُمور سنت کے اطلاق سے خارج ہوجاتے ہیں جو اس تعریف پر پورا نہیں اترتے لیکن احادیث کے دفاتر میں درج ہیں اور مسلمان انھیں سنت سمجھ کر ہی ان پر عمل پیرا ہیں۔ ان اہلِ دانش سے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ اپنے تصورات کی تعبیر کے لیے نئے الفاظ وضع کریں تا کہ غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہے۔

مبہم اصطلاحیں

* بعض ایسے الفاظ اور اصطلاحیں مشہور کی جاتی ہیں جن کا مفہوم انتہائی مبہم ہوتا ہے لیکن انہیں مسلمانوں سے جوڑ دیا جاتا ہے جیسے Terrorism یا دہشت گردی۔ آج تک دہشت گردی کی کوئی جامع تعریف متعین نہیں کی جاسکی چنانچہ اپنے حقوق کی خاطر ہتھیار اُٹھانے والے گروہوں کو بے تامل دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے جبکہ طاقت ور ملکوں کی جانب سے کم زور ممالک کی حکومتوں کو ختم کرنے کے لیے فوجی کارروائیوں کو دہشت گردی نہیں کہا جاتا۔ اس منطق کی رو سے کشمیر میں مسلمانوں کا بھارتی فوج سے لڑنا تو دہشت گردی ہے لیکن عراق پر امریکی حملہ دہشت گردی نہیں ہے۔

* یہی معاملہ Extremism یا 'انتہا پسندی' کا ہے کہ عام طور سے مذہبی طبقات کو انتہا پسندی کا طعنہ دیا جاتا ہے؛ خصوصاً وہ لوگ جو اسلامی شریعت کے نفاذ کی جدوجہد میں مشغول ہوں اور شرعی قوانین پر عمل پیرا ہوں، انھیں انتہا پسند کا خطاب دیا جاتا ہے۔لیکن اس اصطلاح کی بھی کوئی واضح اور متعین تعریف موجود نہیں ہے کہ اس کا معیار اور کسوٹی کیا ہے؟ کب کسی شخص یا گروہ کو انتہا پسند کہا جائے گا؟ اگر سیکولر اقدار و قوانین کی پابندی انتہا پسندی نہیں ہے تو مذہبی تصورات اور قواعد و ضوابط کے نفاذ کا مطالبہ انتہا پسندی کے دائرے میں کیوں کر داخل کیا جاسکتا ہے؟

## شرعی اصطلاحوں کی گھناؤنی تشریح

مغربی میڈیا نے، جو دراصل ان کی فکری یلغار کا ایک مؤثر ترین وسیلہ ہے، آج شرعی اصطلاحوں کو بہت ہی غلط معانی پہنا دیے ہیں اور انھیں اس قدر گھناؤنے تصورات سے جوڑ دیا ہے کہ لوگ انہیں سن کر ہی وحشت میں مبتلا ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ عام مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ مثلاً جہاد کو دہشت گردی، خلافت کو ظالمانہ بادشاہت و موروثیت یا مذہبی پیشواؤں کی حکومت، حدود و تعزیرات کو ظلم و تشدد اور حجاب کو پس ماندگی کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ عالم یہ ہے کہ آج اچھے بھلے پڑھے لکھے مسلمان بھی یہ سوال کرتے ہیں کہ خلافت تو قبائلی معاشرے کا نظام تھا، آج اس کے قیام کی جدوجہد کا کیا فائدہ؟ بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہمیں مغرب کے توحش کو دیکھتے ہوئے ان اصطلاحوں سے دست کش ہو کر انہی کی اصطلاحیں اپنا لینا چاہئیں اور خلافت کی بجائے جمہوریت کی اصطلاح کو رواج دینا چاہیے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان اصطلاحات کے حقیقی مفاہیم کو اجاگر کیا جائے اور مغرب کے اس مکروہ پراپیگنڈے کا مؤثر جواب دیا جائے۔

## اصطلاحوں کی اسلام کاری

اصطلاحات کے باب میں ایک خلط یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ غیر اسلامی تہذیب سے ایک اصطلاح لے کر اس کے ساتھ اسلامی کا سابقہ لگا دیا جاتا ہے اور یوں گویا ایک کافرانہ تصور کو مشرف بہ اسلام کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسلامی اشتراکیت، اسلامی سوشلزم، اسلامی جمہوریت اور اسلامی بینکاری اسی نوعیت کی اصطلاحیں ہیں حالانکہ یہ اسلام سے بالکل مختلف بلکہ متضاد تصورات کی عکاسی کرتی ہیں۔ ہمیں اپنے سیاسی، معاشی اور معاشرتی افکار و تصورات کی تعبیر کے لیے اپنے اسلاف سے منقول مذہبی لٹریچر میں مستعمل لفظیات کو رواج دینا چاہیے تاکہ کفر و اسلام کے نظریات میں فرق و امتیاز باقی رہے اور اسلامی عقائد التباس کا شکار نہ ہوں جیسا کہ فی زمانہ ہم بچشم سر اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

**حرفِ آخر:** اصطلاحوں کا مسئلہ بڑی دقتِ نظر اور تعمق فکر کا متقاضی ہے۔ اربابِ علم و تحقیق کی ذمہ داری ہے کہ وہ مغربی فکر و فلسفہ اور اسلامی تہذیب کا تقابل کرتے ہوئے ان کے باہمی تضادات و امتیازات کو اجاگر کریں اور افرادِ امت کو اس فکری بحران سے نجات دلانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں (محدث لاہور)۔

اسلام اور پاکستان

ڈاکٹر محمد امین

# انسدادِ سود کی تحریک

## اسے مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے چند تجاویز

چند برس پیشتر ملی مجلس شرعی نے (جس کا راقم تاسیسی سیکرٹری جنرل ہے) انسدادسود کے معاملات سے نمٹنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی جس کا کنو ینر مولانا زاہدالراشدی صاحب کو مقرر کیا گیا تھا۔مولانا نے اس پر کام جاری رکھا اور ہمارے مشورے سے اسے 'تحریک انسداد سود' کا نام دے دیا۔دسمبر ۲۰۲۰ء کو اس بارے میں علماء اور تجار کا ایک کنونشن لاہور آسٹر یلیا مسجد میں ہوا جس میں مولانا زاہدالراشدی صاحب نے (جو اس وقت ملی مجلس شرعی کے صدر بھی ہیں) مولانا عبدالرؤف ملک صاحب کو اس تحریک کا صدر مقرر کر دیا۔مولانا عبدالرؤف ملک صاحب جو اس عالم پیری میں بھی جوانوں کا ساجذبہ رکھتے ہیں، اہل علم کا ایک اجلاس اس تحریک کی حکمت عملی پر غور کرنے کے لیے بلایا۔اس میں راقم نے جو گفتگو کی اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

معاشرے کی تین سطحیں ہوتی ہیں: فرد، معاشرہ اور ریاست۔ہمیں اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے تینوں سطحوں پر کام کرنا چاہیے۔افراد کو سمجھایا جائے کہ ہر مسلمان کو اس شنیع کام سے ہر قیمت پر بچنا چاہیے۔کاروبار کرنے یا اسے بڑھانے یا دیگر دنیاوی کاموں (جیسے شادی کرنا، مکان بنانا وغیرہ) کے لیے ہرگز سود نہ لیا جائے۔دینی جماعتوں اور تاجر تنظیموں کو قائل کیا جائے کہ وہ معاشرتی سطح پر، بغیر حکومتی مدد کے، غیر سودی تمویل وتجارت کے لیے ادارے بنائیں اور چلائیں اور اس کام کو سارے ملک میں خاموشی سے پھیلائیں۔اسی طرح حکمرانوں کو سمجھایا جائے کہ وہ سود سے باز آجائیں اور سودی قوانین ختم کر دیں۔سودی قوانین کو غیر اسلامی قرار دلانے کے لیے عدالتی جنگ بھی لڑی جائے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ صرف قانون بنا دینے سے مطلوبہ نتائج اس وقت تک ہاتھ نہیں آتے جب حکومت چلانے والے افراد اس پر مؤثر عمل درآمد کے لیے تیار نہ ہوں مثلاً زکوٰۃ وعشر کا قانون ملک میں موجود ہے لیکن اس کے اچھے معاشی اثرات کہیں نظر نہیں آتے۔(بقیہ صفحہ نمبر:۴۳)

پاکستانیات

احمد فراز

# نوحۂ سقوطِ ڈھاکہ - ۱۶ دسمبر

اب کس کا جشن مناتے ہو؟ اس دیس کا جو تقسیم ہوا
اب کس کے گیت سناتے ہو؟ اس تن من کا جو دونیم ہوا

اس خواب کا جو ریزہ ریزہ ان آنکھوں کی تقدیر ہوا
اس نام کا جو ٹکڑا ٹکڑا گلیوں میں بے توقیر ہوا

اس پرچم کا جس کی حرمت بازاروں میں نیلام ہوئی
اس مٹی کا جس کی حرمت منسوب عدو کے نام ہوئی

اس جنگ کو جو تم ہار چکے، اس رسم کا جو جاری بھی نہیں
اس زخم کا جو سینے پہ نہ تھا، اس جان کا جو واری بھی نہ تھی

اس خون کا جو بدقسمت تھا راہوں میں بہایا تن میں رہا
اس پھول کا جو بے قیمت تھا آنگن میں کھِلا یا بَن میں رہا

اس مشرق کا جس کو تم نے نیزے کی انی مرہم سمجھا
اس مغرب کا جس کو تم نے جتنا بھی لُوٹا کم سمجھا

ان بھوکے ننگے ڈھانچوں کا جو رقص سرِ بازار کریں
یا ان ظالم قزاقوں کا جو بھیس بدل کر وار کریں

یا ان جھوٹے اقراروں کا جو آج تلک ایفا نہ ہوئے
یا ان بےبس لاچاروں کا جو اور بھی دکھ کا نشانہ ہوئے

اس شاہی کا جو دست بدست آئی ہے تمہارے حصے میں
کیوں ننگِ وطن کی بات کرو کیا رکھا ہے اس قصے میں

آنکھوں میں چھپائے اشکوں کو ہونٹوں میں وفا کے بول لیے
اس جشن میں بھی شامل ہوں نوحوں سے بھرے کشکول لیے

استفسارات		مدیر

# تجدد کا شبہ

محترم ڈاکٹر امین صاحب

حال ہی میں آپ کی کتاب ''پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟'' پڑھنے کا موقع ملا۔ اگرچہ آپ نے اس میں ابتداء ہی میں اپنے تجدد کی نفی کی ہے لیکن یہ رویہ تو بہرحال متجد دین ہی کا ہے کہ ''دین کو صرف مَیں صحیح سمجھا ہوں باقی سب لوگوں کا تصور دین غلط ہے''۔ کیا اس تحریر میں آپ کی روش یہی نہیں ہے؟

البرہان

آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ مجھے دینی قوتوں اور علماء کرام کے فہم دین اور ان کے فقہی اور کلامی مسلک ومشرب سے کوئی اختلاف نہیں اور مَیں صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، ائمہ اربعہ، جمہور علماء اور جمہور امت کے فہم دین سے اختلاف نہیں کرتا بلکہ اس کی حمایت کرتا ہوں۔ اسی طرح اہل حدیث بھائیوں کے اعتصام بالتوحید والسنہ، دیوبندی احناف کے معتدل فقہی وکلامی مؤقف اور بریلوی بھائیوں کے حب نبی وتزکیہ کے رویوں کی بھی اصولی تائید کرتا ہوں۔

میں نے دینی قوتوں اور علماء کرام کے جن رویوں سے اختلاف کیا ہے ان کا تعلق عصر حاضر کے حالات پر دینی تعلیمات کے اطلاق اور عصری مسائل کے حل کے حوالے سے دینی جدوجہد کے لیے اختیار کردہ منہج اور حکمت عملی سے ہے، جو ظاہر ہے ایک اجتہادی عمل ہے اور اس کے اسباب بھی عصری ہیں جیسے مغرب کی غالب ملحدانہ فکر وتہذیب سے مرعوب ہو جانا یا اس کے ردّعمل کا شکار ہو جانا اور زوال امت سے سبق نہ سیکھنا وغیرہ۔ نیز دینی عناصر سے میرا اختلاف صرف نظری بنیادوں پر نہیں بلکہ ان کی پچھلی ایک صدی (۱۹۲۴ء [الغائے خلافت] تا ۲۰۲۰ء) کی دینی جدوجہد کے نتائج پر مبنی ہے۔

کوئی بھی سمجھ دار آدمی آپ کی اور میری بات میں جو فرق ہے، اسے سمجھ سکتا ہے۔

ایک لوہار کی　　عبداللہ میر

# منافقت مردہ باد

## سیاسی منافقت

علماء دین کے بارے میں کچھ کہنا ہمیں بہت تکلیف دیتا ہے لیکن بعض اوقات مجبوراً قلم اٹھانا پڑتا ہے۔مولانا فضل الرحمن صاحب اور پروفیسر ساجد میر صاحب آج کل تحریک بحالیٔ جمہوریت (PDM) کے سرخیل بنے ہوئے ہیں۔سوال یہ ہے کہ اس سے اسلام کا کون سا مفاد وابستہ ہے؟ یہ وہی مولانا فضل الرحمن اور پروفیسر ساجد میر ہیں جنہوں نے ممتاز قادریؒ کی شہادت کے وقت اور پنجاب میں 'تحفظ نسواں بل' کے خلاف اسلامی جماعتوں کی عوامی تحریک چلانے کی کوششوں کو سبوتاژ کیا تھا۔ جو برسوں سے اسمبلیوں میں بیٹھے ہیں اور انہوں نے نفاذ شریعت اور اسلام کے لیے کچھ نہیں کیا بلکہ اکثر حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملائی ہے اور مال وجاہ ہی سمیٹا ہے۔صحیح یہ ہے کہ ؎　　چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

## سماجی منافقت

اس تکلیف دہ اور تلخ حقیقت کا اظہار کئی لوگ کئی دفعہ کر چکے ہیں کہ دنیا میں ننگی ویب سائٹس اور ننگی فلمیں دیکھنے والوں میں سرفہرست پاکستانی ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں خود کو اسلام کے علمبردار کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔اس سلسلے کا تازہ واقعہ وہ ہے جس کا اظہار معروف صحافی نصرت جاوید نے ۱۱ دسمبر ۲۰۲۰ء کے نوائے وقت میں اپنے کالم ''برملا'' میں کیا ہے وہ کہتے ہیں: ''اجتماعی طور پر نہایت ڈھٹائی سے ہم ایک مہذب اور دین دار معاشرہ ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ ہماری روزمرہ زندگی کے حقائق اور رویے اگرچہ ہماری ''اصلیت'' کو مسلسل عیاں کرتے رہتے ہیں۔خود کو دھوکا دینے ہی میں تاہم عافیت محسوس ہوتی ہے۔حقائق کو تسلیم کر لینا زندگی کو اذیت ناک بنا سکتا ہے۔ذہنی کوفت اور اذیت سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے مثال کے طور پر گزشتہ دوروز سے اپنا ٹویٹر اکاؤنٹ دیکھنے سے گریز کو ترجیح دے رہا ہوں۔اسے کھولیں تو سکرین پر''Top Trend'' والی اطلاع نمودار ہو جاتی ہے۔اس کے ذریعے ''خبر'' ہمیں یہ دی جاتی ہے کہ پاکستان میں ان دنوں مقبول ترین ہوئے Trends ہمارے سیاسی فریقین کی خواتین کو غلیظ القاب اور ''رکیک فقروں کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ان پر ڈالی سرسری نگاہ مجھ جیسے ڈھیٹ شخص کا خون بھی کھولا دیتی ہے۔''